محبت جیت ہوتی ہے

انیلا کرن

میرا نام تابش ہے۔ تابش جاوید مجھے اپنے بچپن کے بارے میں کچھ بھی یاد نہیں ہے۔ میں نے جب ہوش سنبھالا تو خود کو اپنی خالہ کے گھر میں پایا۔

گندمی رنگت اور سادہ سے نقوش رکھنے والی میری خالہ جو مجھ پر ضرورت سے زیادہ ہی مہربان تھیں۔ بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ وہ مجھے دیکھ دیکھ کر جیتی تھیں تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ اور وہ ایسا کیوں نہ کرتیں آخر میں ان کی اکلوتی مرحومہ بہن کی واحد نشانی تھا۔ اوپر سے بنانے والے نے شکل و صورت ایسی بنائی تھی کہ اجنبی لوگ بھی مجھے پیار کیے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ اور وہ تو میری سگی خالہ تھیں پھر میں بھلا ان کی آنکھوں تارا کیسے نہ بنتا۔ اور صرف خالہ ہی نہیں ان کے گھر کے تمام ہی افراد مجھے بے حد چاہتے تھے۔

سدا کے کم گو اور نہایت انصاف پسند خالو جو ہمیشہ اپنے کام سے کام رکھا کرتے تھے اور دوسروں کے معاملات میں مداخلت کو بالکل بھی پسند نہیں کیا کرتے تھے' اپنے اصولوں کے بہت پکے تھے مگر مجھے بھی وہ ہمیشہ خصوصی رعایت دیا کرتے تھے۔ پھر خالہ کی بوڑھی ساس تھیں جن کا بیشتر وقت چارپائی پر ہی گزرتا تھا اور محلے کی عورتوں میں دو' چار اکثر ہی ان کے پاس پائی جاتی تھیں وہ اپنے پاس اکثر ہی بچوں کی پسند کے کھانے پینے کی چیزیں رکھا کرتی تھیں۔ کبھی اپنے تکیے کے نیچے اور کبھی لوہے کی اس پرانی الماری میں جو ان کی چارپائی کے برابر میں رکھی رہتی تھی اور جس کی چابی انہوں نے بڑی حفاظت سے اپنے گلے میں ڈالی ہوئی سیاہ ڈوری میں پروئی ہوئی تھی۔ دادی جان کی ان چھپا کر رکھی ہوئی چیزوں میں میرا حصہ ہمیشہ باقی بچوں سے زیادہ ہوا کرتا تھا ایک تو دیگر لوگوں کی طرح دادی جان کو بھی مجھ سے کچھ زیادہ ہی محبت تھی اور دوسرے مجھے اپنا مطلب نکالنے کا فن بچپن ہی سے آگیا تھا اور میں چکنی چپڑی باتیں کر کے دادی جان سمیت سبھی سے اپنی بات منوالیا کرتا تھا۔

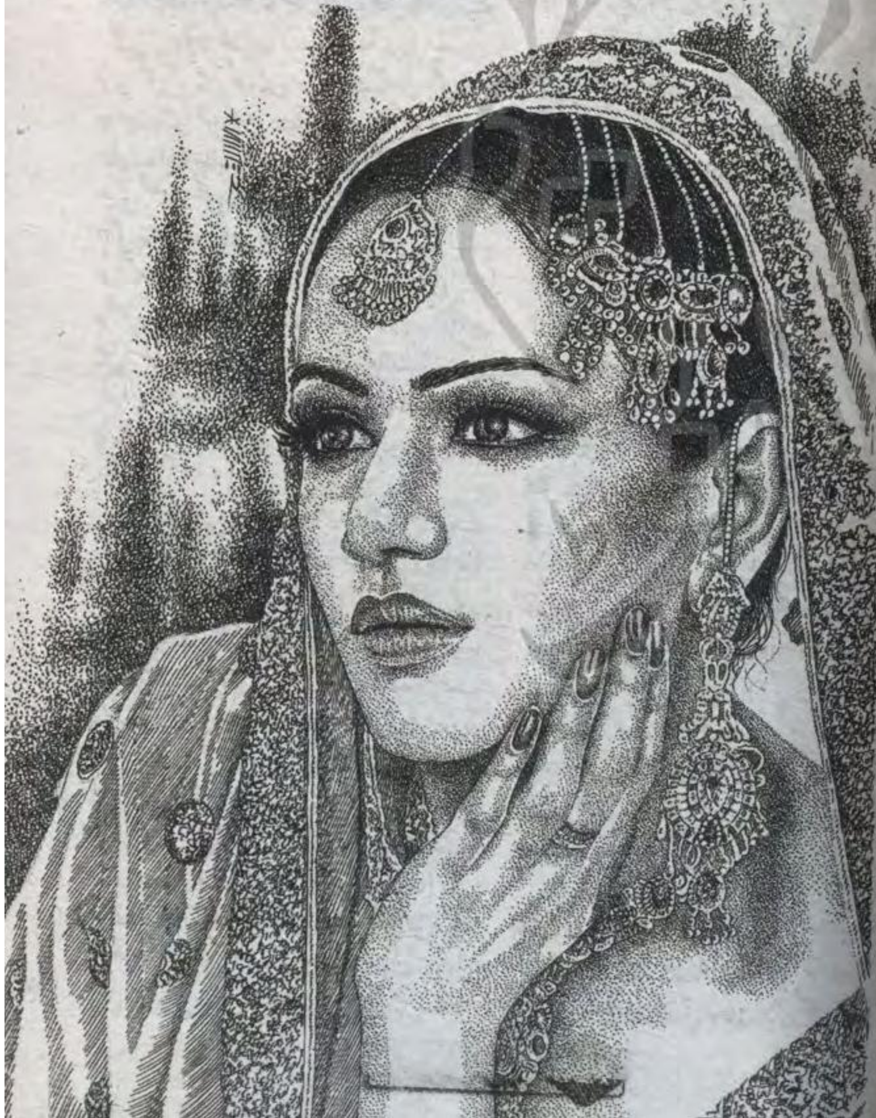
خالہ کے تین بچے تھے سب سے بڑے توقیر بھائی جو بے حد سنجیدہ بلکہ تحصیلے سے انسان تھے۔ ان سے چھوٹی نجمہ باجی جو مجھ سے ساڑھے تین سال بڑی تھیں اور سب سے چھوٹی مرینہ جو مجھ سے دو سال چھوٹی تھی اور بچپن ہی سے میرے مذاق کا سب سے زیادہ نشانہ وہی بنتی آئی تھی۔ وہ شروع ہی سے بے حد شرمیلی اور دبو قسم کی لڑکی تھی۔ اور کالج میں پہنچ جانے تک بھی اس میں اعتماد کی کمی ہی رہی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ہائی اسکول کے دنوں تک تو وہ ایسی ہوا کرتی تھی کہ اگر گھر میں کوئی مہمان آجاتا تو وہ اس کا سامنا کرنے سے بچنے کے لیے کہیں چھپ جایا کرتی تھی۔ حالانکہ وہ گھر میں سب سے چھوٹی تھی مگر پھر بھی اسے گھر میں وہ مقام حاصل نہیں تھا جو مجھے ملا ہوا تھا بلکہ اس نے شاید وہ مقام حاصل کرنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ اور بڑی خاموشی سے بغیر کسی کے کہے اور بغیر کچھ جتائے اس نے گھر کا سب سے چہیتا اور لاڈلا بچہ ہونے کا اعزاز میرے لیے چھوڑ دیا تھا۔

درحقیقت خالہ کے گھر میں سبھی لوگ ایسے ہی بے غرض تھے انہیں خود کو اہمیت دینے یا دوسروں سے اپنی باتیں منوانے کا کوئی شوق ہی نہیں تھا اس لیے اس گھر میں اس قدر سکون اور اطمینان تھا۔ روپے کی کمی ہونے کے باوجود وہاں محبت کی فراوانی تھی جس کا سب سے زیادہ حصہ مجھے ملا ہوا تھا۔ میرے اکثر کلاس فیلوز مجھ پر رشک کرتے تھے اور کبھی کبھی حیرت سے پوچھا کرتے تھے کہ کیا میری خالہ کے گھر میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے۔ جو صرف اپنی ذات کو اہمیت دے اور اپنے آگے مجھ جیسے یتیم اور تنہا بچے کو کچھ بھی نہ سمجھے۔ تب میرا جواب ہمیشہ نفی میں ہوا کرتا تھا کیونکہ میرے حساب سے تو وہاں سب ہی لوگ بہت بے غرض اور محبت کرنے والے تھے۔ مگر تب تک مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ اس گھر میں ایک شخص ایسا بھی ہے جو صرف اپنے بارے میں سوچتا ہے اور صرف اپنی ذات سے پیار کرتا ہے۔ اور وہ شخص میں خود تھا۔

☼ ☼ ☼

میں مومنہ ہوں۔ مومنہ سعید میرا شمار ان لوگوں

ناولٹ



میں ہوتا ہے. جو پیدا ہی آزمائشوں کے لئے ہوتے تھے۔ یا یوں کہہ لیں کہ میرا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جنہیں سیدھے سادے رستوں سے بیر ہوتا ہے اور اس بیر کی وجہ سے وہ زندگی میں بہت سی ایسی تلخیوں اور اذیتوں کا سامنا کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ جن سے عام لوگ بڑی حد تک محفوظ رہتے ہیں۔

میں دو بہنوں اور ایک بھائی سے چھوٹی اور اپنے گھر میں کافی لاڈلی ہوا کرتی تھی۔ خاص طور پر میں ابا سے بہت قریب تھی۔ اور وہ تینوں بڑے بھائی بہنوں سے کہیں زیادہ توجہ مجھ پر دیا کرتے تھے. جس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ میں گھر میں سب سے چھوٹی تھی اور دوسرے میں شروع ہی سے. بہت ذہین ہوا کرتی تھی اور ہمارے ابا کو ذہانت. بہت متاثر کرتی تھی اس لیے وہ میری تعلیم پر بھی خاص توجہ دیتے تھے اور پتا نہیں یہ ابا کی خاص توجہ کا اثر تھا یا میرے اندر ہی کچھ ایسے جراثیم موجود تھے کہ میں جوں جوں بڑی ہوتی گئی تعلیم حاصل کرنے کا شوق میرا جنون بنتا گیا۔ اور میرے ذہن میں اسکول کے دنوں ہی سے یہ خیال نہایت پختہ ہو گیا کہ اگر مجھے معاشرے میں عزت اور اپنی کوئی شناخت چاہیے تو اس کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ میں زیادہ سے زیادہ پڑھوں۔

میں نے لڑکپن سے ہی اعلا تعلیم حاصل کرنے کے خواب دیکھنا شروع کر دیے تھے۔ مگر خواب دیکھنا جتنا آسان ہے ان کی تعبیر حاصل کرنا اتنا ہی مشکل اور کٹھن کام ہے یہ اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب ایک شام ابا چپکے سے ہی ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔ ہم سب کے لیے ہی ان کی اچانک موت بڑا دھچکا تھی مگر میری تو دنیا ہی اندھیر ہو گئی میں ابھی فرسٹ ایئر میں تھی اور بچپن سے لے کر آج تک اپنے خوابوں کے راستے پر ابا کی انگلی پکڑ کر ہی چلی تھی اور اب ابا نہیں رہے تھے تو میرے چاروں طرف جیسے اندھیرا ہی چھا گیا تھا اگرچہ میرا بھائی برسر روزگار تھا اور اس کی آمدنی بھی کافی اچھی تھی مگر اس کو میری تعلیم تو کیا میری ذات سے ہی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کو صرف ان چیزوں میں دلچسپی تھی جو اس کی نئی نویلی اور حسین دلہن کو پسند تھیں اور اس کی دلہن کی پسند میں نہ تو میں آتی تھی اور نہ ہی میری تعلیم' اس لیے جب ابا کی وفات کے ایک ہفتے بعد میں نے کالج جانا دوبارہ سے شروع کیا تو بھابی اور بھائی دونوں نے ہی مجھے دبے لفظوں میں کالج چھوڑنے کا کہہ دیا ان دونوں کا ہی یہ خیال تھا کہ اب گھر کے معاشی حالات ایسے نہیں رہے کہ میری پڑھائی کا خرچہ اٹھایا جا سکے لہٰذا اب مجھے بھی اپنی دونوں بڑی بہنوں کی طرح تعلیم چھوڑ کر گھر بیٹھ جانا چاہیے۔

بھائی اور بھابی کے اس رویے نے مجھے تکلیف پہنچائی تھی مگر ان دونوں کے رویے سے بڑھ کر اذیت مجھے اس چیز سے ہوئی کہ میری دونوں بہنیں بھی ان کی حامی تھیں۔ حالانکہ ان دونوں کو اچھی طرح سے پتا تھا کہ مجھے پڑھنے کا کس قدر شوق ہے۔ میں ان دونوں سے کافی چھوٹی تھی فرزانہ آپا مجھ سے پانچ سال اور ریحانہ آپا سات سال بڑی تھیں اصولاً" تو انہیں اس نازک وقت میں میری ڈھال بننا چاہیے تھا مگر وہ میری ڈھال کیا بنیں انہوں نے تو خود ہی میری جڑیں کاٹنے کا کام شروع کر دیا تھا۔ شاید انہوں نے وقت کی چال کا اندازہ لگا لیا تھا کہ اب گھر کا سربراہ ہمارا باپ نہیں بلکہ بھائی ہے اور ان کی بقا اس میں ہے کہ وہ موجودہ حکمران سے بنا کر رکھیں اور اس کی پیشانی پر کوئی بل نہ آنے دیں اس لیے وہ دونوں ہر معاملے میں بڑھ چڑھ کر بھائی اور بھابی کی حمایت کرتی نظر آنے لگی تھیں بھابی کے آگے پیچھے پھرنا اس کی خوشامد کرنا اور جہاں تک ہو سکے اسے آرام پہنچانا اور دونوں کی زندگی کے مقاصد جیسے خود بخود ہی طے ہو گئے تھے۔ اور رہ گئیں امی تو وہ بے چاری بالکل خاموش ہو گئی تھیں ابا کی اچانک وفات کے بعد انہوں نے کسی بھی معاملے میں دخل نہ دینے کی جیسے قسم ہی کھالی تھی۔

حالات ایسے تھے کہ میں اگر تھوڑی سی بھی کمزور ہوتی تو سب کچھ چھوڑ کر گھر بیٹھ جاتی اور اپنی بہنوں کی طرح دن بھر گھر کے کام کرتی بھابی اور بھائی کی خوشامدیں کرتی اور شادی ہو جانے کے سپنے دیکھتی مگر

میں ایسا نہیں کرنا چاہتی تھی تعلیم حاصل کرنے کا خواب جیسے میری ضد بن گیا تھا اور اس ضد نے ہی مجھے اتنا مضبوط بنا دیا تھا کہ میں بھائی کے سامنے ڈٹ گئی اور تعلیم چھوڑنے سے صاف انکار کر دیا نتیجہ حسب توقع تھا انہوں نے مجھے خرچ نہ دینے سے واشگاف الفاظ میں انکار کر دیا۔

اس چیز کا مجھے پہلے ہی اندازہ تھا اس لیے میں نے پہلے ہی اپنے لیے کچھ ٹیوشنز ڈھونڈ لی تھیں۔ کالج سے آنے کے بعد میں ساری سہ پہر اور شام بچوں کو ٹیوشن پڑھاتی اور رات گئے تک بیٹھ کر خود پڑھا کرتی اس طرح میرا خرچہ تو نکل آتا تھا مگر میرے پاس فرصت اور سکون کا ایک لمحہ بھی نہیں بچتا تھا۔ مجھے دن رات محنت کرنا پڑتی تھی اور اوپر سے گھر کے لوگوں کا رویہ بھی میرے ساتھ بہت برا تھا۔ بھائی اور بھابی تو خیر مجھے مخاطب کرنا بھی پسند نہیں کرتے تھے اور خود میری اپنی بہنیں بھی بھائی اور بھابی کی خوشنودی کی خاطر مجھے نظر انداز کرنے کی پالیسی اپنا چکی تھیں گھر میں صرف ایک امی جان کا دم تھا جن کی وجہ سے مجھے وقت پر کھانا اور دوسری بنیادی ضرورت کی چیزیں مل جاتی تھیں میں انہی کے کمرے میں رہتی تھی اور مجھے رات رات بھر پڑھتے اور اس قدر محنت کرتے دیکھ کر وہ کئی دفعہ بہت رنجیدہ ہو جایا کرتی تھیں لیکن انہوں نے کبھی بھی بھائی کے سامنے میری سفارش کرنے کی کوشش نہیں کی تھی ماں تھیں نا انہیں اپنی اولاد کا اچھی طرح سے پتا تھا اس لیے کچھ کہہ کر وہ اپنی بے عزتی نہیں کروانا چاہتی تھیں۔

مجھے امی جان کی مجبوریوں کا احساس تھا اس لیے میرے دل میں ان کے لیے رتی بھر بھی گلہ نہیں تھا بلکہ یہ ان کی اخلاقی مدد ہی تھی جس کی وجہ سے میں اتنی محنت اور جدوجہد کرنے کے قابل ہو سکی تھی۔ ورنہ باقی سب لوگ تو مجھ سے کسی اچھوت کا سا سلوک کرتے تھے۔

بہاؤ کے مخالف سمت میں تیرنا کیسا لگتا ہے۔ یہ بات مجھ سے بہتر شاید کوئی نہ جان سکے کیونکہ میں نے اپنی نوجوانی کا بیشتر دور اسی طرح سے گزارا ہے۔

☼ ☼ ☼

لڑکپن ہی سے میرے دل میں دولت مند بننے کی شدید خواہش پیدا ہو گئی تھی۔ مجھے غربت نما سفید پوشی سے نفرت تھی ایک ایک روپیہ سوچ سوچ کر خرچ کرنا بسوں اور ویگنوں کے دھکے کھانا اور سال میں معمولی کپڑے کے چند جوڑے بنانا مجھے ان سب چیزوں سے شدید قسم کی چڑ ہو چکی تھی بچپن ہی سے میں سنتا آیا تھا کہ میری شکل و صورت شہزادوں جیسی ہے شاید اسی لیے میرے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ مجھے شہزادوں کی طرح ہی زندگی گزارنی چاہیے۔

میرے دوستوں میں سے کوئی اتنا امیر تھا کہ جس کا طرز زندگی مجھے امارت کے خواب دیکھنے پر اکساتا اور نہ ہی ہمارے خاندان میں کوئی اتنا صاحب حیثیت تھا کہ جس کو دیکھ دیکھ کر میں احساس کمتری کا شکار ہو جاتا۔ البتہ مجھے یہ پتا تھا کہ میرے باپ کا تعلق ایک کھاتے پیتے زمیندار گھرانے سے تھا۔ مگر میرے باپ کا انتقال میری پیدائش کے ڈیڑھ برس بعد ہی ہو گیا تھا اور تب سے ددھیال والوں سے میرا کوئی تعلق بھی باقی نہیں رہا تھا۔ میرے باپ نے میری ماں سے پسند کی شادی اپنے سارے خاندان کی مخالفت مول لے کر کی تھی۔ اس لیے میری ماں کو میرے ددھیال والوں نے دل سے کبھی بھی قبول نہیں کیا تھا اسی لیے جب شادی کے ڈھائی سال بعد ایک زہریلے سانپ کے ڈسنے سے میرے باپ کا انتقال ہوا تو میرے ددھیال والوں نے بغیر کسی لحاظ کے مجھے اور میری ماں کو گھر سے نکال دیا۔

ویسے بھی اس وقت میرے دادا حیات تھے اور ساری خاندانی جائیداد انہی کے نام تھی اور قانون کی رو سے اس جائیداد میں میرا یا میری ماں کا حصہ نہیں بنتا تھا البتہ دادا اگر کچھ دینا چاہتے تو دے سکتے تھے مگر وہ بھلا ایسا کیوں چاہتے انہیں تو مجھ سے اور میری ماں سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ بلکہ وہ تو اگر ہمارا کوئی شرعی حق ہوتا بھی تو ہمیں کچھ نہ دیتے اور نہ ہم ان سے زبردستی کچھ

حاصل کر سکتے تھے بھلا ایک کمزور عورت اور ایک ڈیڑھ سالہ بچے کی ان جدی پشتی جاگیرداروں کے سامنے حیثیت ہی کیا تھی۔ انہوں نے تو میری ماں سے وہ تمام زیورات بھی چھین لیے تھے جو میرے باپ نے اسے وقتاً" فوقتاً" لا کر دیئے تھے۔ اور میری ماں جو محبت کرنے والے جیون ساتھی کی اچانک موت سے ویسے ہی گم سم ہو چکی تھی بغیر کوئی احتجاج کیے میری خالہ کے در پر آن پڑی زندگی میں اس کی دلچسپی تو اس لمحے سے ختم ہو چکی تھی جب میرا باپ دنیا سے رخصت ہوا۔ سال گزر جانے کے بعد اس کی سانسوں کی ڈوری بھی ٹوٹ گئی اور اور یوں میں صرف ساڑھے تین سال کی عمر میں ماں اور باپ دونوں سے ہی محروم ہو گیا۔

فطری طور پر میں لاپروا تھا اس لیے ذرا بڑا ہونے اور اپنے ددھیال کے بارے میں جاننے کے باوجود میرے دل میں کبھی رحیم یار خان جانے یا ان لوگوں سے ملنے کا خیال تک نہیں آیا تھا اور خود ان لوگوں نے بھی مجھ سے کبھی رابطہ نہیں کیا تھا مگر جن دنوں میں میٹرک کے امتحان سے فارغ ہو کر آوارہ گردی کرتا پھر رہا تھا کہ اچانک ہی ایک روز رحیم یار خان سے میری دادی کی آمد ہو گئی۔

میں اس شام کرکٹ کھیل کر گھر پہنچا تو دادی جان کے پاس ایک بوڑھی خاتون کو دیکھ کر مجھے کچھ حیرت سے ہوئی انہوں نے نہایت قیمتی لباس اور زیورات پہن رکھے تھے اور ہمارے ملنے والوں میں سے تو کوئی بھی اتنا امیر کبیر نہ تھا جتنی وہ لگ رہی تھیں اس لیے انہیں دیکھ کر میرا حیران ہونا فطری رد عمل تھا۔

مجھے دیکھتے ہی وہ لپک کر میرے پاس آئیں اور چٹا چٹ میری بلائیں لینے لگیں۔ میں اس اچانک رد عمل سے تھوڑا سا گھبرا گیا مگر میں نے خود کو چھڑانے کی کوشش نہیں کی آخر تھوڑی دیر بعد انہوں نے خود ہی میری بلائیں لینے کا سلسلہ موقوف کیا اپنے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں میرا چہرہ لے کر مجھے محویت سے تکنے لگیں۔

"میرا تابش' میرا پوتا میرے جاوید کی نشانی"

خواب کے سے عالم میں بڑبڑا کر وہ ایک بار پھر مجھے چومنے لگیں۔ ان کے منہ سے نکلے فقرے نے مجھے یہ بتا دیا تھا کہ وہ میری سگی دادی ہیں مگر میں نے ان کے لیے اپنے دل میں کوئی خاص جذبہ محسوس نہیں کیا تھا میں بس تھوڑی دیر ہی وہاں بیٹھا پھر اٹھ کر اپنے کمرے میں آگیا مجھے اپنے ددھیال سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مگر میری یہ بے نیازی زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ دادی مجھے لینے کے لئے آئی تھیں۔

گھر میں سب کا خیال تھا کہ میں ان کے ساتھ جانے سے انکار کروں گا مگر میں نے ایسا نہیں کیا اور فوراً" ہی دادی کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس لیے نہیں کہ میرے دل میں دادی یا اپنے خاندان کے لیے محبت کا کوئی چشمہ پھوٹ پڑا تھا بلکہ اس لیے دادی نے مجھے رحیم یار خان میں اپنے خاندان کی شان و شوکت کے وہ سبز باغ دکھائے تھے کہ میں فیصل آباد میں ہوتے ہوئے بھی خود کو رحیم یار خان کی اس شاندار حویلی میں محسوس کرنے لگا تھا جہاں ہر طرف دولت کی ریل پیل تھی۔ تب نہ تو مجھے خالہ کی آنکھوں میں چمکتے آنسو دکھائی دیئے تھے اور نہ ہی گھر کے دیگر لوگوں کے اترے ہوئے افسردہ چہروں نے مجھے کسی ملال سے آشنا کیا تھا بلکہ مجھے تو یہ بھی خیال نہیں آیا تھا کہ کس طرح میرے ددھیال والوں نے مجھے اور میری ماں کو کسمپرسی کے عالم میں اس شاندار حویلی سے باہر نکالا تھا جہاں میں اب جانے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔

"میں نے آپ کو بتایا نا کہ میں ایک خود غرض انسان تھا"

☼ ☼ ☼

محنت مشقت کی چکی میں لگاتار دو سال تک پس کر میں نے اچھے نمبروں سے ایف ایس سی کا امتحان تو پاس کر لیا تھا مگر میرے گھر میں میری حیثیت تب تک ایک اچھوت کی سی ہو چکی تھی۔ امی جان کے علاوہ گھر کا کوئی فرد مجھ سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا تھا۔ بھابی تو خیر برملا مجھ سے اپنی نفرت کا اظہار کیا کرتی تھیں اور بھائی

بھی مجھے خود سے مخاطب کرنا اپنی توہین سمجھتا تھا۔ اور ایسا کیوں نہ ہوتا آخر میں نے بھی تو وقت کے حکمرانوں کے خلاف علم بغاوت بلند کر رکھا تھا۔ وہ گھر جہاں بھائی اور بھابی کی بات کو ہی حرف آخر سمجھا جاتا تھا۔ وہاں آخر میں اپنی من مانی کر رہی تھی تو اس امر کی سزا تو مجھے ملنا ہی تھی۔

میں اپنی دونوں بہنوں کی طرح بھائی اور بھابی کی جی حضوری کر رہی ہوتی تو میرے ساتھ ایسا توہین آمیز سلوک کبھی روا نہ رکھا جاتا بھابی تب تک ایک بیٹے کی ماں بن چکی تھیں گول مٹول پیارا سا بھتیجا مجھے بے حد اچھا لگتا تھا بچے تو ہمیشہ ہی سے میری کمزوری رہے تھے اور یہ تو میرا اپنا بھتیجا تھا اس لیے مجھے اس کی صورت دیکھ دیکھ کر اس پر پیار آتا رہتا تھا مگر بھابی اپنے بچے کو مجھے ہاتھ بھی لگانے نہیں دیتی تھیں مجھے بہت ہی کم اسے اٹھانے اور پیار کرنے کا موقع ملتا تھا ورنہ اکثر میں دل مسوس کر ہی رہ جایا کرتی تھی۔

میری بہنیں بھی مجھے شاذو نادر ہی مخاطب کیا کرتی تھیں۔ ان دونوں کی منگنیاں قریب کے گاؤں میں ہو چکی تھیں اور وہ دن رات بھابی کی چاپلوسی کر کر کے اپنے جہیز کی چیزیں بنانے میں مصروف رہا کرتی تھیں ایسے میں مجھ سے بات کر کے وہ ان مراعات سے ہاتھ نہیں دھونا چاہتی تھیں جو فی الحال انہیں حاصل تھیں۔

میں ان سب باتوں کو شدت سے محسوس کرتی تھی مگر سوائے صبر اور برداشت کے میرے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ بدترین حالات کے باوجود میں اپنے خوابوں سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھی۔ مجھے معاشرے میں ہر صورت اپنے لیے ایک الگ مقام بنانا تھا میں ساری زندگی ذلت کی اس چکی میں پسنے کے لیے تیار نہیں تھی جس میں میرے طبقے کی ننانوے فیصد عورتیں پستی تھیں۔

ابا مجھے ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے خود میری بھی یہی خواہش تھی۔ مگر اب اس خواہش کو پورا کرنا اتنا آسان نہیں رہا تھا' ابا دنیا سے جا چکے تھے اور میں بالکل بے یار و مددگار تھی۔ معاشی تو کیا مجھے کسی کی جذباتی مدد بھی حاصل نہ تھی سوائے امی جان کے اور امی جان تو بے چاری دنیا سے بالکل ہی کنارہ کر چکی تھیں ان کو ہر وقت گم سم اور اداس دیکھ کر کبھی کبھی مجھے حیرت ہوا کرتی تھی ابا کی زندگی میں مجھے کبھی یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ وہ امی کے لیے اس قدر اہم ہیں کہ ان کے چلے جانے کے بعد ہنستی مسکراتی امی جان غم کی تصویر بن کر رہ جائیں گی۔

ایف ایس سی کے پیپرز کے بعد ہی میری دوستوں اور کلاس کی ان تمام لڑکیوں نے جو میڈیکل میں جانے کا ارادہ رکھتی تھیں مختلف اکیڈمیز جوائن کر لی تھیں ان اکیڈمیز میں میڈیکل کے انٹری ٹیسٹ کی تیاری کروائی جاتی تھی۔ میڈیکل میں جانے کی میری خواہش شاید ان سب لڑکیوں سے زیادہ شدید تھی جنہوں نے ان اکیڈمیز کو جوائن کیا تھا مگر میرے پاس ان کے جیسے وسائل نہیں تھے۔ میں نے ٹیوشنز پڑھا پڑھا کر اگرچہ کچھ رقم جمع کر لی تھی مگر یہی قلیل رقم میرا کل اثاثہ تھی اگر یہ میں انٹری ٹیسٹ کی تیاری میں خرچ کر دیتی تو میڈیکل کالج کی فیس کہاں سے دیتی اس لیے میں نے دل مسوس کر اپنے طور پر ہی ٹیسٹ کی تیاری شروع کر دی۔

میری دونوں دوستیں میرے حالات سے بخوبی واقف تھیں اس لیے اس موقع پر ان دونوں نے ہی میری بہت مدد کی۔ وہ اپنے اکیڈمی کے لیکچرز اور نوٹس مجھے دینے کے علاوہ پڑھائی میں جہاں تک ہو سکتا تھا۔ میری مدد بھی کر دیا کرتی تھیں۔ ان دونوں کا یہ تعاون میرے لیے بہت مددگار ثابت ہوا۔ محنت تو اگرچہ میں دن رات کر رہی تھی مگر ان کے تعاون سے مجھے یہ پتا چل گیا کہ ٹیسٹ کس طرح کا آئے گا اور اسے کس طرح سے کرنا ہو گا اپنی شب روز کی محنت اور دونوں دوستوں کے تعاون سے آخر کار میں نے یہ معرکہ بھی سر کر لیا۔

میرا انٹری ٹیسٹ کلیر ہو گیا۔ اور مجھے میڈیکل میں ایڈمشن مل گیا۔ مگر اس کامیابی کی مجھے کافی بڑی قیمت

چکاناڑی میری دونوں دوستوں نے مجھ سے ہمیشہ کے لئے قطع تعلق کرلیا وجہ بس اتنی سی تھی کہ میرا میڈیکل میں داخلہ ہو گیا تھا اور ان دونوں کا نہیں ہوسکا تھا۔ اگرچہ ان دونوں کی ناکامی میں کسی بھی طرح سے میرا قصور نہیں بنتا تھا مگر پھر بھی انہوں نے پہلے مجھ سے اکھڑے اکھڑے رہنا شروع کیا اور کچھ ہفتوں بعد مجھ سے تعلق بالکل ہی توڑ دیا اور میں قصوروار نہ ہوتے ہوئے بھی ان کی نظروں میں مجرم بن گئی اس زمانے میں تو جیسے ہر شخص کو پرمٹ ملا ہوا تھا کہ وہ جس معاملے میں بھی چاہے اور جیسے بھی چاہے مجھے قصوروار ٹھہرائے اور میری ناکردہ غلطیوں پر مجھے سزا دے۔ میں ان دونوں کے سامنے اپنی صفائی میں ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکی تھی اور خاموشی سے دوستی کے اس گھنے سائے سے محروم ہو گئی تھی جس کی ٹھنڈک نے ہمیشہ مجھے ستانے اور سکون کی چند گھڑیاں گزارنے کا موقع دیے رکھا تھا۔

بے حد خاموشی اور اداسی کے عالم میں میں نے بہاولپور جانے کی تیاری شروع کردی جہاں قائداعظم میڈیکل کالج میں میرا داخلہ ہوا تھا۔



رحیم یار خان میں میرے دادا کی بنائی ہوئی وہ حویلی بلاشبہ بے حد شاندار اور پرتعیش تھی۔ مگر اس شاندار اور پرتعیش حویلی میں میری کوئی حیثیت نہیں تھی۔ دادا کا انتقال ہو چکا تھا اور حویلی میں دادی کے علاوہ میرے دو تایا اور ایک چچا اپنے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ کہنے کو تو وہ کئی لوگ تھے اور ان سب سے ہی میرا خون کا رشتہ تھا مگر حقیقت یہ تھی کہ میں ان سب لوگوں کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکتا تھا۔ دادی کے علاوہ وہاں کوئی مجھ سے مخاطب ہونے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ اور یہ دادی ہی کا وجود تھا۔ جو مجھے اس حویلی میں رہنے کی اجازت مل گئی تھی ورنہ ان سب لوگوں کی آنکھوں میں میرے لیے جو نفرت تھی وہ دیکھنے کے لیے کسی خاص چشمے کی ضرورت نہیں تھی۔

حویلی میری دادی کے نام تھی شاید اس لیے وہ لوگ مجھے وہاں سے نکالنے کا حوصلہ نہیں کرپائے تھے۔ اور نفرت کے باوجود مجھے وہاں رکھنے پر مجبور تھے۔ وہاں رہتے ہوئے میں نے اپنے مزاج کے خلاف اپنے کزنز اور دیگر رشتہ داروں کو اپنا بنانے کے لیے ہر وہ کوشش کی جو میرے بس میں تھی میں ان لوگوں میں گھل مل جانا چاہتا تھا مگر وہاں موجود لوگوں میں سے کسی ایک نے بھی میرے ان جذبات کی پذیرائی نہیں کی ان سب کا سلوک میرے ساتھ حویلی کے ملازمین سے بھی برا تھا۔ ملازمین کو تو وہ پھر بھی کچھ نہ کچھ اہمیت دے لیا کرتے تھے مگر مجھے وہ بالکل ہی بے وقعت سمجھتے تھے۔ اور میں، جو خالہ کے گھر میں رہتے ہوئے ہمیشہ سے سب کی آنکھوں کا تارا رہا تھا صرف اور صرف عیش و آرام کی زندگی حاصل کرنے کی خاطر یہ ذلت سہنے پر مجبور تھا کیونکہ دادی مجھے یہی کہہ کر فیصل آباد سے لے کر آئی تھیں کہ وہ اپنے حصے کی تمام جائیداد اور یہ حویلی میرے نام کردیں گی۔ اس بات کا علم ابھی باقی لوگوں کو نہیں تھا ورنہ وہ شاید مجھے قتل کرنے سے بھی دریغ نہ کرتے۔

دادی کسی مناسب موقع کے انتظار میں تھیں کہ کسی روز وکیل کو بلا کر میرے تایا اور چچا کے علم میں لائے بغیر جائیداد کی منتقلی میرے نام ہو جائے خود مجھے بھی اس مبارک دن کا شدت سے انتظار تھا جب میں بلا شرکت غیرے اس شاندار حویلی کا مالک ہوتا میں تصور ہی تصور میں ان تمام لوگوں کو جو وہاں دن رات مری تذلیل کیا کرتے تھے خود کو اس حویلی سے نکل جانے کا حکم دیتے دیکھتا تو میرا دل اندر تک خوشی اور سکون کے احساس سے بھر جایا کرتا تھا۔ مگر میرا یہ انتظار ہی رہا اور دادی ایک رات سوتے میں ہی چپکے سے اللہ کو پیاری ہو گئیں۔

دادی کی اچانک وفات باقی سب کے لیے بھی دھچکا تھی مگر میری تو دنیا ہی اندھیر ہو گئی کیونکہ دادی نے اپنے وعدے کے مطابق نہ تو جائیداد یا حویلی میں سے کچھ میرے نام کیا تھا اور نہ ہی میرے لیے کوئی وصیت

چھوڑی تھی اس لیے اب مجھے کچھ ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا میرے تایا اور چچا تو میرے سلام کا جواب دینا پسند نہیں کرتے تھے۔ جائیداد مجھے کیسے دے سکتے تھے پھر بھی مجھے موہوم سی امید تھی کہ شاید وہ لوگ اپنی مری ہوئی ماں کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے مجھے حویلی میں ہی رہنے دیں آخر دادی خود فیصل آباد جا کر مجھے لے کر آئی تھیں مگر میری یہ خوش فہمی بھی خوش فہمی ہی رہی ان لوگوں نے دادی کی تدفین کے تیسرے ہی دن مجھے تین کپڑوں میں حویلی سے نکال باہر کیا اور ایسا کرتے ہوئے نہ تو ان میں سے کسی کے خون نے جوش مارا اور نہ ہی کسی کو مجھ پر ترس آیا۔

میں سارا دن گاؤں کی گلیوں میں لاچار پھرتا اور روتا رہا مگر وہاں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو مجھے گلے لگا کر تسلی دیتا میرا دکھ بانٹتا یا میرے شقی القلب ددھیال والوں سے مجھے اس حویلی میں رہنے کا حق دلواتا جہاں میرے باپ نے اپنی ساری عمر گزاری تھی۔

سارا دن بے بسی اور دکھ کے سائے میں گزارنے کے بعد میں اسی شام فیصل آباد کے لیے روانہ ہو گیا خالہ کا گھر ہی اس بھری دنیا میں میرا واحد ٹھکانہ تھا اور مجھے اب وہاں ہی جانا تھا۔

یوں میں تین ماہ بعد ہی اپنے آبائی گاؤں سے واپس لوٹ آیا ان تین ماہ نے مجھے سوائے ذلت اور بے بسی کے احساس کے کچھ نہیں دیا تھا البتہ اتنا ضرور ہوا تھا کہ میری دولت حاصل کرنے کی خواہش پہلے سے کئی گنا بڑھ گئی تھی۔



میڈیکل کالج میں داخلہ ہونے پر جہاں میں بے حد خوش تھی وہی اندر ہی اندر کئی پریشانیاں بھی مجھے ستا رہی تھیں سب سے بڑا مسئلہ تو رقم کا تھا اگرچہ ایڈمشن کے لیے رقم میں نے جمع کر رکھی تھی اور وہ اس مقصد کے لیے کافی بھی ثابت ہوئی تھی مگر چونکہ میرا داخلہ فیصل آباد کے پنجاب میڈیکل کالج میں نہیں ہو سکا تھا اس لیے اب بہاولپور جا کر مجھے نا صرف ہاسٹل میں رہنا تھا بلکہ وہیں اپنے لیے ٹیوشنز یا کسی پارٹ ٹائم جاب کا بندوبست بھی کرنا تھا۔

یہ ایسے مسائل تھے جنہوں نے صحیح معنوں میں میری راتوں کی نیند اڑادی تھی ایک بالکل اجنبی شہر جہاں آپ کا کوئی دوست کوئی واقف کار نہ ہو وہاں جا کر رہنا اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے کام کرنا اور اوپر سے میڈیکل کی مشکل پڑھائی، مجھے بعض اوقات اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگتا سوچ سوچ کر میرا دماغ شل ہو جاتا مگر مجھے کوئی راستہ سجھائی نہ دیتا اور عجیب بات یہ تھی کہ بظاہر یہ لگنے کے باوجود کہ میں ان تمام مسائل سے نبرد آزما نہیں ہو سکتی میں نے ایک بار بھی یہ نہیں سوچا کہ میں بہاولپور نہ جاؤں۔ میں نے یہ موقع بہت محنت اور قربانیاں دے کر حاصل کیا تھا اور اب اسے ضائع کرنے کا میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی، اسی ادھیڑ بن میں دن گزرتے جارہے تھے جب ایک رات امی جان نے مجھے اپنے پاس بلایا اور چپکے سے کافی بڑی رقم مجھے تھمائی میں ہکا بکا کھڑی کبھی ان کا چہرہ اور کبھی اپنے ہاتھ میں موجود اس رقم کو دیکھے جارہی تھی جو میرے سارے نہ صحیح مگر بہت سے مسائل حل کر سکتی تھی۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ امی جان نے اتنی بڑی رقم کہاں سے لی ہو گی اور جب میرے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ انہوں نے اپنا زیور میری تعلیم کی خاطر چپکے سے بیچ دیا ہے تو میری آنکھوں سے بے اختیار ہی آنسو بہنے لگے، امی جان کے پاس زیادہ زیور نہیں تھا مگر جتنا بھی ان کا کل اثاثہ یہی تھا اور اب میری خاطر انہوں نے اپنا یہ اثاثہ بھی فروخت کر دیا تھا وہ بھی بغیر گھر میں کسی کو خبر کیے میرا دل چاہا کہ میں امی جان کے قدموں سے لپٹ جاؤں میری بظاہر ساری دنیا سے لاتعلق ہو جانے والی ماں نے کس طرح میری پریشانیوں کو نا صرف محسوس کیا تھا بلکہ ان کو حل کرنے کی مقدور بھر کوشش بھی کی تھی۔

"جیتی رہو بیٹا اللہ تعالیٰ تمہیں کامیاب کرے" مجھے گلے لگا کر تسلی دیتے ہوئے وہ خود بھی آبدیدہ ہو گئی تھیں اس رات انہوں نے بہت عرصے کے بعد

مجھ سے بہت ساری باتیں کہیں مجھے کئی نصیحتیں کیں کہ میں اجنبی شہر میں جاکر کیسے رہوں اور کن کن چیزوں کا خیال رکھوں میں پورے دھیان سے ان کی تمام نصیحتوں کو سنتی رہی اور دل ہی دل میں ان پر عمل کرنے کا عہد بھی کرتی رہی۔

امی جان کی دی ہوئی رقم میں سے ہاسٹل کی فیس اور ضروری اخراجات کے لیے رقم نکال کر میں نے باقی رقم بہاولپور پہنچتے ہی بینک میں جمع کروادی میں اس رقم کو صرف انتہائی ضرورت کے وقت ہی خرچ کرنے کا ارادہ رکھتی تھی کیونکہ مجھے اچھی طرح سے پتا تھا کہ اس رقم کے بعد اب امی جان بھی میری کوئی معاشی مدد نہیں کرسکتیں اس لیے میں ان روپوں کو سوچ سمجھ کر خرچ کرنا چاہتی تھی۔

کلاسز جوائن کرنے کے دو ہفتے بعد ہی مجھے اپنی ایک کلاس فیلو کے توسط سے ایک بہت اچھی ٹیوشن مل گئی ایک ہی گھر کے تین بچوں کو ان کے گھر جاکر پڑھانا تھا بچے سٹی گرامر اسکول میں پڑھتے تھے اور اس لیے ان کا کورس بھی کافی مشکل تھا اور مجھے ان کو پڑھانے کے لیے اچھی خاصی محنت کرنا پڑتی تھی مگر ٹیوشن پڑھانے کا معاوضہ اتنا اچھا تھا کہ میرے ماہانہ اخراجات آرام سے پورے ہوجایا کرتے تھے۔ ہاسٹل کے واجبات اور کالج کی فیس امی جان کی دی ہوئی رقم سے ادا ہوجاتی تھی اور یوں مجھے پڑھنے کے لیے کچھ نہ کچھ وقت مل جایا کرتا تھا اگر میں اس ایک ٹیوشن کے علاوہ مزید کوئی کام تلاش کرتی تو مل سکتا تھا مگر اس صورت میں میری اپنی پڑھائی ڈسٹرب ہوکر رہ جاتی ابھی بھی مجھے اکثر رات گئے تک اپنی نیند کی قربانی دے کر پڑھنا پڑتا تھا کیونکہ دن میں تو مجھے بالکل ہی وقت نہیں ملتا تھا۔

دو سال تک میں نے ٹیوشن پڑھائی پھر وہ لوگ کسی دوسرے شہر شفٹ ہوگئے تو مجھے ایک کوچنگ سینٹر میں شام کی تین کلاسز مل گئیں اور یوں میرا کام چلتا رہا۔

ایم بی بی ایس کے بعد مجھے اپنے ایک ٹیچر کی مہربانی سے وہیں بہاول وکٹوریہ ہسپتال میں ہاؤس جاب کا موقع بھی مل گیا اور ایک سال کا ہاؤس جاب مکمل ہوتے ہی میں فیصل آباد لوٹ آئی۔ گزشتہ پانچ سالوں میں صرف تین بار گھر آئی تھی وہ بھی محض چند روز کے لیے ایک تو میری اپنی پڑھائی اور جاب کی مصروفیات بے تحاشا ہوا کرتی تھیں اوپر سے گھر میں مجھے جس قسم کے رویوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا میں خود ہی فیصل آباد آنے سے احتراز کرتی تھی۔ اور اب پانچ سال کے بعد ہمیشہ کے لیے اپنے گھر لوٹ آئی تھی مگر اس بار میرے دل پر ہمیشہ جیسے بوجھ نہیں دھرے تھے بلکہ زندگی میں شاید پہلی بار میں خود کو بے حد ہلکا پھلکا اور خوش محسوس کررہی تھی۔

میں ڈاکٹر بن چکی تھی اور یہ بہت بڑی کامیابی تھی اس کامیابی کا سرور ہی اتنا تھا کہ مجھے اپنے اردگرد کی بدصورتی اب پہلے کی طرح پریشان نہیں کرتی تھی۔ حالانکہ میرے گھر میں اگر کچھ بدلا تھا تو صرف یہ کہ میری دونوں بہنوں کی شادیاں ہوچکی تھیں ورنہ بھائی اور بھائی کا رویہ میرے ساتھ پہلے جیسا توہین آمیز ہی تھا ان کے بچے بھی مجھ سے دور دور رہتے تھے اور امی جان پہلے سے بڑھ کر خاموش طبع ہوچکی تھیں۔

☼ ☼ ☼

صرف تین ماہ اور دو دن کے بعد میں ایک بار پھر وہیں آپہنچا تھا جہاں سے چلا تھا یعنی خالہ کے گھر اسی غربت نما سفید پوشی کی دنیا میں جہاں آپ اپنے عیبوں اور اپنی کمزوری پر اتنا شرمندہ نہیں ہوتے جتنا ان مجبوری اور کمزوریوں کے دوسروں پر کھل جانے سے ہوتے ہیں۔ جہاں ایک نیا سوٹ خریدنے کے لیے بھی خصوصی بچت کرنا پڑتی ہے اور جہاں اچھا کھانا صرف کسی خاص موقع پر ہی نصیب ہوتا ہے۔

میں نے اپنی زندگی کے پچھلے پندرہ برس اس گھر میں گزارے تھے مجھے وہاں کی سفید پوشی یا شاید غربت سے چڑ تھی مگر پہلے یہ چڑ اتنی شدید نہیں تھی جتنی اب ہوگئی تھی اب تو مجھے اس زندگی سے باقاعدہ نفرت ہوگئی تھی۔ رحیم یار خان کی اس شاندار حویلی میں گزارے تین ماہ نے میرے مزاج اور میری سوچ پر

بہت گہرا اثر ڈالا تھا۔ امارت اور شان و شوکت کی زندگی کو اتنے قریب سے دیکھ لینے اور قریب قریب اپنی ملکیت محسوس کرلینے کے بعد اب مجھ سے پہلے والے حالات برداشت نہیں ہورہے تھے۔ مجھے اپنی قسمت سے بے تحاشا گلے پیدا ہوگئے تھے۔ بعض اوقات میرا دل چاہتا کہ میں چیخ چیخ کر رونا شروع کردوں۔ آخر میرے ساتھ ہی یہ سب کیوں ہوا۔ کیا ضروری تھا کہ دادی کو اپنی عمر کے آخری حصے میں میرا خیال آتا اور وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر جاتیں یا پھر یہ ضروری تھا کہ وہ مجھے سہانے خواب دکھا کر بغیر میرے لیے عملی طور پر کچھ کیے یوں چپ چاپ دنیا سے رخصت ہوجاتیں۔ دادی کے آنے سے پہلے خالہ کے گھر میں اگر میں بہت خوش نہیں تھا تو ناخوش بھی کبھی نہیں رہا تھا مگر اب تو یہ گھر مجھے جیسے کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔ رات کو سونے کے لیے لیٹتا تو یوں لگتا کہ کمرے کی دیواریں میری طرف جھکتی چلی آرہی ہیں اور کوئی لمحہ آتا ہے جب یہ دیواریں میرا دم گھونٹ دیں گی یا گھر کی بوسیدہ چھت میرے وجود پر آگرے گی۔ اس طرح کی سوچوں اور خیالات نے میری زندگی کو اجیرن بناکر رکھ دیا تھا۔ حالانکہ خالہ کے گھر میں سب نے مجھے نہ صرف ہاتھوں ہاتھ لیا تھا بلکہ میری دلجوئی میں بھی انہوں نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ ان میں سے کسی نے بھی مجھے ایک بار بھی یہ احساس نہیں دلایا تھا کہ میں ان سب کی محبتوں اور خلوص کو ٹھکرا کر وہاں سے گیا تھا الٹا وہ لوگ مجھے خوش رکھنے کے جتن کرکر کے ہلکان ہورہے تھے مگر میں تھا کہ سنبھلنے میں ہی نہیں آرہا تھا۔ میرا دل ہر چیز سے اچاٹ ہوچکا تھا۔ اسی لیے میٹرک میں پاس ہوجانے کے باوجود میں آگے پڑھنے کے لیے راضی نہیں ہوا تھا اور سب کے منع کرنے کے باوجود میں نے ایک دوست کے چچا کے ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں ملازمت کرلی تھی۔ جس سے ہونے والی آمدنی محدود تھی مگر اس سے میری کم سے کم اچھا کھانے اور اچھا پہننے کی خواہش کسی نہ کسی حد تک پوری ہونے لگی تھی۔

ایک سال تک میں نے یہ کام کیا مگر پھر میں اس سے بھی اکتا گیا میں ساری عمر کے لیے سیلز مین تو بن کر نہیں رہ سکتا تھا۔ مجھے دولت چاہیے تھی شان و شوکت سے زندگی گزارنا میرا اولین مقصد بن چکا تھا اور میرے پاس اس وقت اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے واحد راستہ تعلیم کا ہی تھا۔ اس لیے پڑھائی میں زیادہ دلچسپی نہ ہونے کے باوجود میں نے اگلے سال کالج میں ایڈمیشن لے لیا۔ گزشتہ ایک سال کے دوران میرے وجود پر چھائی مایوسی کے بادل اگر مکمل طور پر چھٹے نہیں تھے تو بھی ان میں تھوڑی بہت کمی ضرور ہوگئی تھی۔ اس لیے میں دھیرے دھیرے نارمل زندگی کی طرف لوٹنے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

فیصل آباد آنے کے بعد میں نے چند ماہ ایک پرائیویٹ اسپتال میں جاب کی پھر مجھے سرکاری جاب مل گئی تو میں نے سول اسپتال جانا شروع کردیا ان دنوں میں بے حد مطمئن اور پرسکون رہنے لگی تھی کیونکہ میرے حساب سے میرا جدوجہد کرنے اور تکلیفیں اٹھانے کا زمانہ گزر گیا تھا میں نے جتنی محنت کرنا تھی وہ کرلی تھی اور میرا خیال تھا کہ اب میرا اس طویل جدوجہد اور محنت کا پھل کھانے کا زمانہ آچکا ہے مگر میری یہ سوچ زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکی تھی اور میرے سکون اور اطمینان کو رخصت ہوتے بھی زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔

امی جان اب بیمار رہنے لگی تھیں اور ان کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ اپنے جیتے جی مجھے میرے گھر کا کر جائیں میرے آنے کے بعد انہوں نے بارہا اس خواہش کا اظہار بھی کیا تھا میں پہلے پہل تو اس ذکر کو ہنسی میں ٹالتی رہی مگر پھر جب امی جان کی بے قراری دیکھی تو مجھے بھی اس معاملے میں سنجیدہ ہونا پڑا اگرچہ میں نے کبھی دوسری لڑکیوں کی طرح راتوں کو تاروں کی چھاؤں میں بیٹھ کر کسی بانکے سجیلے راجکمار کے سپنے تو نہیں دیکھے تھے بلکہ درحقیقت مجھے کبھی

ایسے سپنے دیکھنے کی فرصت ہی زندگی نے نہیں دی تھی مگر تھی تو میں ایک لڑکی ہی نا۔

امی جان کے سامنے شادی کی ہامی بھرنے کے ساتھ ہی میری آنکھوں نے ان گنت خواب سجانے شروع کردیے تھے۔ اس وقت تک میرا خیال تھا کہ میری شادی ہوجانا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ آخر میں ڈاکٹر بن چکی تھی ہر ماہ ہزاروں کماتی تھی پھر جلد ہی اپنا چھوٹا سا کلینک بھی سیٹ کرنے والی تھی۔ بھلا کسی بھی خاندان کو مجھے اپنی بہو بنانے یا کسی بھی لڑکے کو مجھ سے شادی کرنے میں کیا اعتراض ہوسکتا تھا مگر بعد کے حالات نے ثابت کردیا کہ یہ سب میری خوش فہمیاں ہی تھیں۔

میرے ڈاکٹر بن جانے سے نہ تو لوگوں کی سوچ میں کوئی تبدیلی آئی تھی اور نہ ہی معاشرے کی ترجیحات میں کوئی فرق پڑا تھا۔ وہاں اب بھی سب کچھ ویسا ہی تھا۔ لڑکوں کی مائیں اور بہنیں ابھی بھی اپنے لیے بہو اور بھابھی ڈھونڈتے ہوئے لڑکی کی دس خوبیوں کو بھلا کر اس کی کسی ایک کمزوری کو ایشو بنا سکتی تھیں اور جتنی چاہے لڑکیوں کو ریجکٹ کرسکتی تھیں۔ انہیں اس چیز سے کوئی مطلب نہیں تھا کہ مومنہ سعید نے ڈاکٹر مومنہ سعید بننے کے لیے کتنا کٹھن اور تکلیف وہ سفر ننگے پاؤں طے کیا ہے۔ انہیں تو بس یہ نظر آتا تھا کہ میرے سر پر باپ کا سایہ نہیں ہے میرا بھائی مجھ سے لاتعلق نظر آتا ہے اور لاتعلق نظر نہ بھی آتا تب بھی وہ کوئی صاحب حیثیت انسان تو تھا نہیں اور یہ کہ ڈاکٹر بننے کے باوجود میں بہرحال ایک درمیانی سی شکل و صورت کی بے حد عام سی لڑکی تھی۔

میرے لیے آنے والا سب سے پہلا رشتہ میرے ایک کولیگ اور سابقہ کلاس فیلو ڈاکٹر ارسلان کا تھا۔ درمیانی قامت اور مناسب سی شکل و صورت کا ارسلان بے حد سنجیدہ اور کم گو انسان تھا۔ دوران تعلیم تو میری اس کے ساتھ شاذ و نادر ہی کبھی بات ہوتی تھی مگر جب سے ہم نے اکٹھے سول اسپتال میں جاب شروع کی تھی تو پرانے کلاس فیلوز ہونے کے ناتے اور کچھ اس وجہ سے کہ اکثر ہمارے ڈیوٹی ٹائمنگ بھی ایک جیسے ہی ہوا کرتے تھے ہمارے درمیان کسی حد تک بے تکلفی پیدا ہوگئی تھی اور پھر جب ایک روز میں نے باتوں باتوں میں ارسلان کو اپنی امی کی خواہش کے بارے میں بتایا تو وہ بے چین سا ہوگیا اور اس روز اس نے میرے سامنے اقرار کرلیا کہ وہ کالج کے دنوں سے ہی مجھے پسند کرتا ہے اور مجھ سے شادی کرنے کا خواہاں ہے۔

میں نے اگرچہ ارسلان کے بارے میں کبھی بھی اس طرح سے نہیں سوچا تھا مگر اس کے منہ سے یہ سب سن کر مجھے قدرتی طور پر بے حد خوشی کا احساس ہوا اس دنیا میں کوئی ایسا شخص بھی تھا جو میرے بارے میں سوچتا تھا مجھے اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا تھا یہ احساس اتنا خوش کن تھا کہ مجھے اپنا وجود ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا اس رات میں دیر تک آئینے کے سامنے بیٹھی رہی اور اپنے چہرے کے ایک ایک نقش کو بہت توجہ اور محبت سے دیکھتی رہی میں اگرچہ عام سی شکل و صورت کی مالک تھی مگر اس رات نہ جانے کیوں مجھے اپنا ایک ایک نقش بے حد خاص اور خوبصورت لگ رہا تھا۔

اگلے تین دن تک میں یونہی ہواؤں میں اڑتی رہی مگر تین روز بعد جب ارسلان کی امی اور بہنیں ہمارے گھر آئیں اور انہوں نے مجھے اور میرے گھر کو دیکھتے ہی ریجکٹ کردیا تو میرے دل کی خوشی لمحوں میں اڑن چھو ہوگئی۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد میں دیر تک گم سم سی بیٹھی رہی۔ پھر نہ جانے کیسے میرے ذہن میں یہ خیال آگیا کہ ارسلان ان لوگوں کو ان کی ناپسندیدگی کے باوجود منالے گا۔ اس کی امی اور بہنیں نہ سہی مگر وہ تو مجھے پسند کرتا ہے اس خیال نے میرے دل کو تھوڑی سی تقویت پہنچائی تھی مگر اگلے روز اسپتال میں جب میں نے ارسلان کو خود سے نظریں چراتے دیکھا تو میں اتنی دلبرداشتہ ہوئی کہ اس سے اس کے رویے کی تبدیلی کا سبب بھی نہ پوچھ سکی اور پھر جب ارسلان کی شادی ڈاکٹر سدرہ سے ہوئی تو میں بالکل ہی ڈھے گئی۔

ڈاکٹر سدرہ مجھ سے ایک سال بڑی اور مجھ سے بھی زیادہ معمولی شکل کی مالک تھی مگر اس کا پلس پوائنٹ اس کے باپ اور بھائیوں کی وہ دولت تھی جو میرے اور میرے خاندان کے پاس نہیں تھی اس روز مجھے دولت کی ضرورت اور قدر و قیمت کا صحیح معنوں میں احساس ہوا میں دن رات مشقت کرکے ڈاکٹر بن گئی تھی مجھے اچھی جاب مل گئی تھی میں نے پرائیویٹ بھی تھوڑا بہت کام شروع کردیا تھا اور ماہانہ اتنا کمانے لگی تھی کہ اپنی تمام ضروریات بخوبی پوری کرسکتی تھی اپنی پسند کے کپڑے اور جوتے خرید سکتی تھی اپنی مرضی کا کھا سکتی تھی مگر ان سب چیزوں سے مجھے معاشرے میں وہ عزت اور وہ وقار نہیں مل سکتا تھا جس کے لیے میں نے اتنی اذیتیں اٹھائی تھیں۔

ارسلان کے بعد بھی میرے لیے کئی رشتے آئے مگر ان میں سے جو اچھے اور پڑھے لکھے لڑکوں کے رشتے تھے انہوں نے ہمارے گھر کے در و دیوار سے لپٹی مفلسی کو دیکھ کر دوبارہ ادھر کا رخ نہیں کیا اور جنہوں نے مجھے اور میرے گھر کو پسند کیا وہ کسی طرح بھی میرے معیار کے لوگ نہیں تھے وہ سب ویسے ہی رشتے تھے جس طرح کے لڑکوں سے میری دونوں میٹرک پاس بہنوں کی شادیاں ہوئی تھیں تو پھر اگر مجھے انہی کی طرح رہنا تھا ویسی ہی زندگی گزارنا تھی تو مجھے اتنی محنت کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ تھک ہار کر میں نے شادی کرنے سے ہی انکار کردیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہوجائے میں اس نام نہاد معاشرتی نظام کے آگے ہتھیار نہیں ڈالوں گی۔

میرے شادی سے انکار کے فیصلے کو سن کر امی جان مزید خاموش تو ضرور ہوگئی تھیں مگر انہوں نے مجھ سے کچھ نہیں کہا تھا۔ اور میرے لیے اتنا ہی بہت تھا کہ انہوں نے مجھ پر کوئی پریشر ڈال کر میرا فیصلہ تبدیل کروانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ حالانکہ میں اچھی طرح سے جانتی تھی کہ امی جان کو میری شادی کروانے کی کس قدر شدید خواہش ہے مگر میں ان کی یہ خواہش پوری کرنے سے قاصر تھی میری فطرت کچھ اس طرح کی تھی کہ میں دب کر اور مزاج کے خلاف کوئی سمجھوتہ کرکے رہ ہی نہیں سکتی تھی ورنہ شاید امی جان کی خاطر میں یہ بھی کر گزرتی۔ جو زباں سے تو کچھ نہیں کہتی تھیں مگر ان کی آنکھوں میں ہر روز میرے لیے ایک ہی سوال ہوتا تھا جس سے میں روز ہی نظریں چرالیتی تھی۔ اور پھر یہ نظریں چرانے کا سلسلہ بھی موقوف ہوگیا امی جان بھی ایک رات چپ چاپ مجھے چھوڑ کر چلی گئیں۔ ان کی موت نے مجھے مزید تنہا اور اکیلا کردیا میں نے مصروف رہنے کے لیے ایک دوسری جگہ بھی جاب شروع کردی۔ اب میں اچھا خاصا کمانے لگی تھی اور شاید اسی وجہ سے میرے بھائی بھابی اور بہنوں کا رویہ بھی میرے ساتھ اچھا ہوگیا تھا۔ اگرچہ میں ان لوگوں کے ساتھ اب بھی گھلتی ملتی نہیں تھی مگر اب میں ان کی کسی نہ کسی حد تک مالی مدد کرنے لگی تھی۔

امی جان کی وفات کو ابھی چھ ماہ ہی ہوئے تھے جب مجھے بہت اچھی سیلری پیکج کے ساتھ سعودی عرب میں جاب مل گئی اور میں سب کچھ چھوڑ کر وہاں روانہ ہوگئی۔



پڑھائی میں شروع ہی سے میرا دل نہیں لگتا تھا۔ کتاب کھولتے ہی مجھ پر اکتاہٹ طاری ہوجایا کرتی تھی۔ جس کی وجہ سے بعض اوقات گھنٹوں کتاب کھول کر بیٹھے رہنے کے باوجود میں کچھ بھی پڑھ نہیں پاتا تھا۔ اس لیے ہر کلاس میں میں بس مارے باندھے پاس ہوجایا کرتا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ میں اچھی کارکردگی دکھانے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ مگر چونکہ مجھے پڑھنے میں کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی اور پھر میں کوئی بہت ذہین بھی نہیں تھا اس لیے ہمیشہ اوسط درجے بلکہ شاید اوسط سے بھی کچھ نچلے درجے کا طالب علم ہی رہا مگر اپنے حالات کو دیکھتے ہوئے میں پڑھائی کو کبھی چھوڑنے کا سوچ بھی نہ سکا کیونکہ اس کے علاوہ میری پاس آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ آخر کار

کسی نہ کسی طرح روپیٹ کر میں نے پہلے بی کام اور پھر ایم کام کی ڈگری حاصل کر ہی لی۔ مگر معاشرے میں کوئی مقام پانے کے لیے اور اپنی زندگی کو اچھی طرح سے گزارنے کے لیے یہ ڈگری کافی ثابت نہیں ہو سکی۔

آٹھ ماہ تک ہر طرح کی کوشش کرنے کے بعد بھی مجھے کوئی ڈھنگ کی ملازمت نہیں مل سکی تو مجبوراً خالو جان کو میرے لیے کوشش کرنا پڑی اور انہوں نے کسی نہ کسی طرح مجھے ایک پرائیویٹ بینک میں ملازمت دلوادی جو میرے مزاج کے مطابق تو ہرگز نہیں تھی مگر سال بھر سے جو میں جوتیاں چٹخاتا پھر رہا تھا اس سے مجھے اتنا تو اندازہ ہو ہی گیا تھا کہ جیسی میری قابلیت ہے اور جس طرح میں نے ڈگری لی ہے مجھے اس سے بہتر ملازمت ملنا تقریباً" ناممکن ہی ہے۔ یہی سوچ کر میں نے وہ ملازمت کرلی مگر جب میں نے بینک جانا شروع کیا تو مجھے صحیح معنوں میں دانتوں پسینہ آگیا۔ بے تحاشا کام لمبی ٹائمنگ اور بات بہ بات پڑنے والی جھڑکیوں نے مجھے ملازمت تو کیا زندگی سے ہی بے زار کرنا شروع کردیا۔ میرے سارے خواب شیشے کے کھلونوں کی طرح بکھر گئے تھے اور مجھ میں اتنا حوصلہ بھی نہیں تھا کہ میں ان ٹوٹے ہوئے خوابوں کی کرچیوں کو چن سکوں۔ میں اتنا دکھی اور بے زار ہوچکا تھا کہ بعض اوقات مجھے اپنے آپ پر رحم آنے لگتا تھا۔ میں زندگی سے کیا چاہتا تھا اور زندگی مجھے کیا دے رہی تھی۔ میں جیسے تقدیر کے ہاتھوں میں ایک کھلونے کی طرح تھا ایک ایسا کھلونا جو اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ان دنوں مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ ہر چیز سے ایک عجیب سی چڑ محسوس ہونے لگی تھی۔ میں بس یہ چاہتا تھا کہ کہیں سے کوئی خزانہ میرے ہاتھ لگ جائے اور میں وہ سب حاصل کرلوں جس کے لیے میں اتنے برسوں سے ترستا آرہا ہوں۔

اور پھر شاید قدرت کو مجھ پر رحم آگیا تھا کہ ایک روز بالکل اچانک ہی میرے سامنے ڈاکٹر مومنہ کی شکل میں ایک خزانہ آگیا۔



سعودی عرب میں میں نے چار سال کام کیا پھر مجھے برطانیہ جانے کا موقع مل گیا تو میں وہاں چلی گئی اور اگلے سات برس تک میں نے وہاں کام کیا اور بے تحاشا روپیہ کمایا۔ یہی وجہ تھی کہ جب میں پورے گیارہ برس کے بعد اپنے وطن واپس لوٹی تو اتنی دولت مند ہوچکی تھی کہ میرے اپنے بھائی بہن اور دیگر رشتہ دار تک مجھ سے مرعوب رہنے لگے تھے۔ میں نے جتنا روپیہ کمایا تھا۔ اس میں سے بیشتر کہیں نہ کہیں انویسٹ کرتی گئی تھی جواب مجھے کئی گنا ہو کر واپس مل رہا تھا۔ میں جتنی دولت کمانے کا عزم کرکے ملک سے باہر گئی تھی اس سے کہیں زیادہ کما رہی تھی۔ اور میرے پاس بلاشبہ روپے کی ریل پیل ہوچکی تھی۔ مگر میں نے اپنی زندگی کے گیارہ قیمتی سال اس دولت کے حصول میں گنوادیئے تھے۔ اب میری عمر بتیس سال سے اوپر ہوچکی تھی۔ اور میرے حساب سے اب میری شادی کا کوئی چانس نہیں بچا تھا۔ اس لیے اب میں اس بارے میں کبھی بھولے سے بھی نہیں سوچتی تھی بلکہ اس بارے میں سوچنا تو میں نے اس وقت چھوڑ دیا تھا جب اپنے دل پر بے وقعتی ناقدری کے ڈھیروں ڈھیر زخم لے کر میں نے اپنا ملک چھوڑا تھا پچھلے گیارہ سالوں میں بھی اگرچہ کچھ لوگ تھے جو مجھ سے شادی کرنے کے خواہاں نظر آئے تھے مگر مجھے کسی کو بھی آزمانے کا حوصلہ نہیں ہوا تھا۔ اور میں اپنی آنکھیں بند کیے بس اپنے متعین کیے ہوئے راستے پر چلتی رہی تھی۔ مگر پاکستان آنے کے بعد جب اپنے بھائی اور اپنی بہنوں کے بچوں کو دیکھتی تو کبھی کبھی میرے اندر یہ خواہش مچلنے لگتی تھی کہ کاش ان بچوں کے بیچ میں میرے اپنے بچے بھی ہوتے۔ مگر میں اپنی اس خواہش کو سختی سے کچل دیا کرتی تھی۔

اس دنیا میں کچھ بھی پانے کے لیے ہر انسان کو اس کی ایک قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ میں نے دولت حاصل کرلی تھی تو اس کی قیمت بھی تو مجھے ہی چکانا تھی نا۔

اور شاید اس کی قیمت یہی تھی کہ میں فطری زندگی سے دور رہوں اور تنہا رہوں۔ سو میں یہ قیمت چکا رہی تھی۔

واپس آنے کے بعد میں چند روز ہی اپنے بھائی کے گھر ٹھہری تھی پھر میں نے شہر کے پوش علاقے میں ایک شاندار کوٹھی خرید لی اور وہاں منتقل ہوگئی۔ کوٹھی کے نچلے پورشن کو میں نے اپنے کلینک کا درجہ دیا تھا۔ اور روز شام کو دو گھنٹے وہاں بیٹھا کرتی تھی۔ اس کے علاوہ میں نے اپنے ہسپتال کی تعمیر بھی شروع کروادی تھی۔ اور شہر کے دو مہنگے ہسپتالوں میں ہفتے میں تین تین دن کے لیے جانے لگی تھی ہر طرف سے مجھے بے تحاشا آمدنی ہورہی تھی۔ جو رقم میں نے مختلف نوعیت کے کاروبار میں لگا رکھی تھی وہ بھی دن دوگنی اور رات چوگنی ہو کر بڑھ رہی تھی۔ اور اب میرے اپنے بھائی اور بہنوں سے بھی اچھے تعلقات قائم ہوگئے تھے۔ میں اکثر ہی ان لوگوں سے ملنے چلی جایا کرتی تھی اور وہ لوگ بھی باقاعدگی سے میرے گھر آتے رہتے تھے۔ اب چونکہ میں ان لوگوں کو قیمتی تحائف دے سکتی تھی اور جب بھی جس کو جتنی رقم کی ضرورت ہوتی میں بغیر کوئی سوال کیے ان لوگوں کو دے دیا کرتی تھی اس لیے اب میں ان سب کی چھوٹی لاڈلی بہن تھی۔ جس میں بظاہر ان سب کی جان تھی ان کے بچے بھی میرے آگے پیچھے پھرا کرتے تھے۔ اور مجھے ان سب کا یوں میرا خیال رکھنا اچھا لگتا تھا اس لیے میں نے کبھی کسی کے سامنے ماضی کا ذکر نہیں کیا تھا اور نہ ہی خود ان تلخ دنوں کو سوچتی تھی جو بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ ہاں کبھی کبھی مجھے امی جان کا خیال بے چین کردیا کرتا تھا اور مجھے ان کی آخری خواہش یاد آنے لگتی تھی جس کا اظہار انہوں نے اپنی موت سے صرف آدھا گھنٹہ پہلے میرا ہاتھ تھام کر کیا تھا۔

"مومنہ! تم شادی ضرور کرنا۔ جب بھی جیسے بھی آدمی سے کرو مگر یہ کام ضرور کرنا۔"

انہوں نے بہت مدھم سرگوشی —— میں مجھے کہا تھا۔ تب تو میں نے روتے ہوئے اثبات میں سر بھی ہلا دیا تھا مگر دل سے میرا شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اور بعد میں بھی میں اپنے اس عزم پر قائم رہی تھی کہ مجھے شادی کرنا ہی نہیں ہے مگر اب جب سے میں پاکستان آئی تھی نہ جانے کیوں مجھے وہ رہ رہ کر امی کی خواہش یاد آرہی تھی۔ جو ہر بار ہی مجھے بے چین کردیا کرتی تھی۔ مگر میں اپنی جھیل جیسی پرسکون زندگی میں کوئی تلاطم نہیں چاہتی تھی اس لیے کوشش کرکے اس طرح کے خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا کرتی تھی۔ اور شاید میں عمر بھر ایسا ہی کرتی رہتی اگر میری زندگی میں وہ شخص نہ چلا آتا جس نے اس پرسکون جھیل میں ایسا کنکر پھینکا کہ پھر اس جھیل کے پرسکون پانیوں میں پھیلنے والے بھنوروں کو روکنا میرے بس میں ہی نہ رہا۔



خالو کے ایک بڑے بھائی —— اس گاؤں میں رہتے تھے جہاں ہمارا گھر تھا۔ ان کے گھر ہمارا بہت زیادہ آنا جانا تو نہیں تھا مگر خالہ اکثر ہی ان کے گھر چلی جایا کرتی تھیں کیونکہ اپنے جیٹھ کی دونوں بہوؤں سے ان کی گاڑھی چھنتی تھی۔ البتہ میں ان کے گھر بمشکل دو چار مرتبہ ہی گیا تھا کیونکہ وہاں میری دلچسپی کا کوئی سامان نہیں تھا تایا جان' خالو سے کئی سال بڑے تھے اور ان کے سبھی بچوں کی شادیاں میرے اسکول کے زمانے میں ہی ہوگئی تھیں اس لیے میری وہاں کسی سے دوستی تو کیا معمولی سی بے تکلفی بھی نہیں تھی مگر اس روز مجھے خالہ کے اصرار پر ان کے ساتھ وہاں جانا پڑا کیونکہ گھر میں میرے علاوہ کوئی بھی ایسا نہیں تھا جس کے ساتھ وہ اس وقت وہاں جاسکتیں اور انہیں وہاں کوئی ضروری کام تھا اس لیے مجھے ان کے ساتھ جانے کے لئے راضی ہونا ہی پڑا۔

ان کا گھر چونکہ گاؤں کے آخری سرے پر تھا اس لیے میں خالہ کو اپنی سیکنڈ ہینڈ موٹر سائیکل پر وہاں لے گیا۔ تایا کے گھر کے دروازے پر جب میں نے موٹر سائیکل روکی تو وہاں دیوار کے ساتھ کھڑی شاندار بی ایم

ڈبلیو نے ایک لمحے میں میری توجہ اپنی طرف مبذول کروالی۔ مجھے اتنی شاندار اور قیمتی کار وہاں دیکھ کر بے حد حیرت ہو رہی تھی۔ تایا کے مالی حالات ہم سے قدرے بہتر تھے مگر اتنے اچھے بھی نہیں تھے کہ بی ایم ڈبلیو رکھنے والے لوگوں کا ان کے گھر آنا جانا ہو۔

حیرت زدہ سا میں خالہ کے ساتھ گھر کے اندر آیا تو حیرت کا دوسرا جھٹکا مجھے وہاں ایک کرسی پر بیٹھی گندمی رنگت والی دبلی پتلی خاتون کا دیکھ کر لگا اس لیے نہیں کہ اس کا چہرہ میرے لیے اجنبی تھا بلکہ اس لیے کہ وہ قیمتی لباس اور ہیروں کا اتنا شاندار زیور پہنے ہوئے تھی۔ جو ہمارے خاندان کی عورتوں نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا ہوگا۔ اگرچہ اس کی شکل و صورت میں کوئی خاص بات نہیں تھی مگر اس کے قیمتی لباس زیورات اور اس کے رکھ رکھاؤ نے اسے بے حد شاندار اور منفرد شخصیت بنادیا تھا۔

میں دل ہی دل میں اس سے بری طرح سے مرعوب ہوچکا تھا مگر میں نے چہرے سے کچھ بھی ظاہر نہیں ہونے دیا۔ وہاں موجود تایا کی چھوٹی بہو نے اس کا تعارف ہم سے کروایا وہ اس کی چھوٹی بہن تھی اور ڈاکٹر تھی۔ تب مجھے یاد آیا کہ پچھلے کچھ عرصے سے خالہ "تایا کی بہو کی چھوٹی بہن کا بارہا تذکرہ کرچکی تھیں۔ جو گیارہ سال باہر گزار کر واپس پاکستان آئی تھی اور بہت دولت مند ہوچکی تھی۔ تب تو میں نے ان باتوں پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی کیونکہ میرے ذہن میں جب بھی اس کا کوئی نقشہ بنا وہ تایا کی چھوٹی بہو جیسا ہی بنا تھا۔ عمر رسیدہ" معمولی شکل کی مالک اور بے حد عام سی شخصیت "مگر ڈاکٹر مومنہ تو میرے اندازوں سے بالکل مختلف لگ رہی تھی۔ اس کی عمر بے شک زیادہ تھی خصوصاً" مجھ سے تو وہ یقیناً" کئی سال بڑی تھی مگر دبلی پتلی جسامت اور اپنے رکھ رکھاؤ کی وجہ سے وہ اتنی زیادہ عمر کی لگ نہیں رہی تھی جتنی عمر کی وہ تھی۔ پھر بے تحاشا دولت نے اس کی شخصیت میں جو تمکنت پیدا کردی تھی۔ وہ بھی اسے بہت خاص بنا رہی تھی۔

ہمارے وہاں آنے کے بعد وہ بس تھوڑی دیر ہی رکی تھی پھر وہاں سے رخصت ہوگئی۔ مگر وہ جتنا وقت بھی ہمارے سامنے رہی میں نے اس کو کئی مرتبہ تعریفی اور ستائشی نظروں سے اپنی جانب دیکھتے ہوئے پایا۔ یہ میرے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ میری شکل و صورت اور پرسنالٹی اتنی ہی شاندار تھی کہ پہلی بار ملنے والے حیرت زدہ اور ستائشی نظروں سے مجھے بار بار دیکھا ہی کرتے تھے مگر مومنہ کا یوں اپنی طرف — دیکھنا میرے لیے خاص اہمیت کا حامل تھا۔ اس کے یوں اپنی طرف دیکھنے سے مجھے فخر کی بجائے ایک عجیب سی مسرت کا احساس ہو رہا تھا اور مسرت کا یہ احساس اس کے جانے کے بعد بلکہ رات گئے تک میرے ساتھ رہا تھا۔ میں سارا وقت مومنہ ہی کے بارے میں سوچتا رہا تھا اور رات کو سونے سے پہلے میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ میں کسی بھی طرح مومنہ سے شادی ضرور کروں گا۔ دولت جائیداد اور اپنی من پسند آسائشیں حاصل کرنے کا اس سے اچھا موقع دوبارہ نہیں مل سکتا تھا۔ بے شک وہ عمر میں مجھ سے کئی سال بڑی تھی مگر اس سے شادی ہوجانے کی صورت میں مجھے جو کچھ حاصل ہوسکتا تھا اس کو سامنے رکھتے ہوئے میں عمروں اور شکل و صورت کے فرق کو بخوشی بھولنے پر تیار تھا۔

اگلی صبح ہی میں نے کسی نہ کسی طرح تایا کی بہو سے مومنہ کا ایڈریس اور فون نمبر معلوم کرایا۔ اور اسی شام اس سے ملنے کے لیے اس کے شاندار کلینک میں جا پہنچا۔ میں جو بازی کھیلنے جا رہا تھا۔ اسے جیتنے کے لیے ضروری تھا کہ جتنی جلدی ہوسکے میں اپنا پتہ پھینک دوں۔ اور میں نے یہی کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

تابش کو میں نے پہلی بار اپنی بڑی بہن کے گھر میں دیکھا۔ وہ اس کی چچی ساس کا بھانجا تھا۔ اور اپنے ماں باپ کے انتقال کے بعد خالہ کے پاس ہی رہ رہا تھا۔ میں غائبانہ طور پر اس سے واقف تھی۔ کچھ ہفتے پہلے ہی میری بہن نے باتوں باتوں میں اس کا تذکرہ کیا تھا اور بتایا تھا کہ اس کی چچی ساس جلد ہی تابش کی شادی اپنی

چھوٹی بہن سے کرنے والی ہیں۔ تب تو میں نے قدرتی طور پر اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ کیونکہ نہ میں تابش کو جانتی تھی اور نہ ہی اس کی خالہ کی بیٹی کو۔ مگر اس روز جب میں نے پہلی بار تابش کو روبرو دیکھا تو مجھ پر ایک عجیب سی خود ترسی کی کیفیت طاری ہوگئی۔

وہ بلا کا خوبصورت اور وجیہہ تھا میں نے اس سے پہلے اتنا خوبصورت مرد کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میری نظریں نہ چاہتے ہوئے بھی بار بار اس کے چہرے پر بھٹک رہی تھیں۔ اور مجھے رہ رہ کر اس لڑکی کی قسمت پر رشک آرہا تھا جسے اتنا شاندار شریک سفر ملنے والا تھا۔ ساتھ ہی مجھے اپنا آپ بہت کم مایہ لگ رہا تھا اور میں سوچ رہی تھی کہ کاش کوئی اتنا ہی شاندار شخص مجھے بھی ملا ہوتا تو زندگی کتنی مکمل اور خوبصورت ہوتی۔ میرے دماغ پر اس روز عجیب و غریب سی سوچیں طاری تھیں جنہوں نے گھر آنے کے بعد بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ اتنے سالوں سے تھپک تھپک کر سلائے گئے میرے ارمان اس روز اچانک ہی ایک بار پھر سے جاگنے لگے تھے۔ حالانکہ وجہ کچھ بھی نہیں تھی۔ تابش اگر بہت خوبصورت تھا اور اس کی کسی لڑکی سے شادی ہو رہی تھی تو اس سے میرے جینے مرنے پر بھلا کیا فرق پڑتا تھا مگر میں جانے کیوں بار بار اس کو سوچے جا رہی تھی اور پریشان ہو رہی تھی مگر اللہ کا شکر ہے کہ میری یہ کیفیت بس چند گھنٹوں تک رہی تھی۔

شام کا وقت تو میرا یوں بھی بے حد مصروف گزرا کرتا تھا۔ اس لیے کلینک جاکر میرے ذہن سے اس کا خیال بتدریج محو ہوتا گیا۔ اور اگلی صبح تک میں اسے تقریباً" فراموش کرچکی تھی۔ مگر اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس شام وہ مجھ سے ملنے چلا آیا۔ میں تب کلینک سے اٹھنے ہی والی تھی جب مجھے اس کے آنے کی اطلاع دی گئی۔ پہلے تو مجھے اس کے آنے پر شدید قسم کی حیرت ہوئی پھر خیال آیا کہ شاید اسے کسی مریض کو دکھانا ہوگا یا کوئی اور اس طرح کی بات ہوگی۔ اور میرے ساتھ چونکہ ان لوگوں کی دور پرے کی ہی سہی مگر رشتے داری تو ہے اس لیے وہ میرے پاس چلا آیا۔ جب تک پیون نے مجھ سے اجازت لینے کے بعد اسے اندر نہیں بھیج دیا میرے دماغ میں یونہی طرح طرح کے خیالات آتے رہے۔

وہ کمرے میں داخل ہوا تو وہاں جیسے روشنی سی پھیل گئی۔ بلو جینز اور لائننگ والی آف وہائٹ شرٹ میں وہ بلا کا خوبصورت لگ رہا تھا مجھے اعتراف ہے کہ اسے سامنے پاکر میں اپنی تمام تر مضبوطی اور اعتماد کے باوجود ایک پل کے لیے نروس ہوگئی تھی اور ایسا شاید اس کی بے مثال خوبصورتی کی وجہ سے تھا۔ بہر حال جیسے تیسے میں نے خود کو کمپوز کرکے بیٹھنے کے لیے کہا۔

"کیسے آنا ہوا تابش صاحب؟"

رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے بڑی تہذیب سے اس سے سوال کیا تھا اس نے فوراً" جواب دینے کی بجائے چند لمحے توقف کیا اور پھر اپنی بے حد خوبصورت آنکھیں میری آنکھوں میں ڈال کر بڑے سکون سے بولا۔

"مومنہ! میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

میرے قریب جیسے کوئی دھماکہ ہوا تھا۔ میں ساکت بیٹھی تحیر زدہ سی اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

مجھے یہ بات اچھی طرح سے معلوم تھی کہ مومنہ کے سامنے اگر شادی کی پیشکش میں نے فوراً" نہ رکھی تو بعد میں میرے لیے اتنی ہمت کرنا مشکل سے مشکل تر ہوتا جائے گا اس لیے اس شام اس کے کلینک میں جب اس سے ملاقات ہوئی تو میں نے وہاں بیٹھنے کے محض تین منٹ بعد ہی اس سے شادی کرنے کی خواہش کا اظہار کردیا میری بات سن کر وہ گویا سکتے میں آگئی تھی۔ اس کے تو سان و گمان میں ہی نہیں ہوگا کہ میں اس سے ایسی بات بھی کہہ سکتا ہوں اور وہ بھی اتنی اچانک کتنی ہی دیر تک وہ خاموش بیٹھی حیرت زدہ نظروں سے مجھے دیکھتی رہی پھر بولی بھی تو اس کی آواز سے بے یقینی مترشح تھی۔

"تم جانتے ہو تم کیا کہہ رہے ہو؟"

اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔

"میں جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں۔ بہت سوچ سمجھ کر کہہ رہا ہوں"

"تمہیں پتا ہے میں عمر میں تم سے کتنی بڑی ہوں؟"

اس نے سب سے پہلے وہی اعتراض کیا تھا جس کی میں توقع کررہا تھا اس لیے میں مسکرا کر آرام سے بولا۔

"جب عمر کی پروا مجھے نہیں ہے تو آپ کیوں کررہی ہیں؟"

چاہنے کے باوجود میں اسے تم کہہ کر مخاطب نہیں کرپایا تھا جس کی وجہ اس کی عمر مجھ سے زیادہ ہونے سے بڑھ کر اس کی شخصیت کا رعب تھا جو مجھ پر کافی اثر انداز ہورہا تھا۔ مگر میں پوری کوشش کررہا تھا کہ میرے دل کی مرعوبیت میرے چہرے پر نہ آسکے اور اس کوشش میں کافی حد تک کامیاب بھی رہا تھا اس لیے مومنہ نے مجھ سے نہ تو کوئی سخت لفظ کہا اور نہ ہی کسی ناگواری کا اظہار کیا بلکہ اس کے برعکس اس نے بڑی نرمی سے مجھ سے معذرت کی تھی۔

"میں معافی چاہتی ہوں تابش ! مگر ایسا ہونا کسی صورت ممکن نہیں ہے۔ امید ہے کہ تم اس بارے میں دوبارہ کوئی بات نہیں کروگے"۔ اس نے بڑے ناصحانہ اور مدبرانہ انداز سے کہا تھا مگر مجھے ــــ اس کا انداز برا لگا اور نہ ہی میں مایوس ہوا۔ اسے ہسپتال جانا تھا وہ اٹھی تو میں بھی اٹھ کر آگیا مگر میں نے ہمت نہیں ہاری اور اگلے ایک ماہ تک اسے منانے کی ہر ممکن کوشش کرتا رہا۔ کبھی اس کے کلینک جاتا کبھی گھر اور فون تو روز ہی کیا کرتا تھا۔ میرے اس قدر حوصلے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ مومنہ نے مسلسل انکار کرنے کے باوجود ایک بار بھی مجھ سے سختی سے بات نہیں کی تھی اور نہ ہی مجھ سے ملنے سے انکار کیا تھا۔ البتہ اس نے شاید اپنی بہن کو بتادیا تھا۔ اور اس کی بہن سے بات میری خالہ تک پہنچ گئی تھی۔ اس لیے ایک رات خالہ نے مجھ سے اس بارے میں بازپرس کی اور مجھے میرے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ وہ میری شادی مرینہ سے کرنا چاہتی تھیں۔ مگر میں مرینہ سے شادی کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ اگرچہ وہ خوبصورت اور سگھڑ لڑکی تھی۔ میں اس سے بہت مانوس بھی تھا۔ مگر اس سے شادی کرنے کا مطلب تھا کہ مسائل کا ایک انبار اپنے سر پر لاد لیا جائے۔ میرا اپنا کوئی گھر نہیں تھا اور مرینہ سے شادی کی صورت میں ظاہر ہے کہ مجھے اپنے لیے الگ گھر کا بندوبست کرنا پڑتا میں ساری عمر تو خالو جان کے گھر میں نہیں رہ سکتا تھا اور اگر میں ایسا کرتا تو کچھ دوسرے مسائل بھی لازمی پیدا ہوتے اس لیے میں خالہ جان کے آنسوؤں اور التجاؤں کو نظرانداز کرکے چپ چاپ ان کے سامنے سے اٹھ آیا مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں مرینہ سے شادی کرکے دردر بھٹکتا پھروں اور ساری عمر ترس ترس کر گزاردوں میں ایسا اسی صورت میں کرسکتا تھا اگر مجھے مرینہ سے محبت ہوتی مگر مجھے اس سے محبت نہیں تھی اور محبت تو مجھے مومنہ سعید سے بھی نہیں تھی جس کو اپنے ساتھ شادی کرنے کے لیے میں پچھلے ایک ماہ سے رضامند کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

میں نے کہا نا کہ میں ایک خودغرض انسان تھا۔



تابش بلاشبہ بہت خوبصورت تھا کسی خواب کی طرح کسی تصور جیسا۔ اور مجھے پہلی نظر میں وہ بہت اچھا بھی لگا تھا بلکہ اسے دیکھ کر مجھے ایک عجیب سے احساس زیاں نے بھی بڑی دیر تک اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ مگر اس کے باوجود جب اس نے مجھے شادی کی پیشکش کی تو میں سخت حیران ہوئی۔ یہ بات ایک بار بھی میرے ذہن میں نہیں آئی تھی اسے دیکھ کر میں جس احساس زیاں کا شکار ہوئی تھی اس کی وجہ میری یہ سوچ تھی کہ کاش مجھے صحیح وقت پر اسی طرح کا ہم سفر ملا ہوتا ورنہ میں نے تو یہ تصور بھی نہیں کیا تھا کہ خود سے سات آٹھ سال چھوٹے شخص کے ساتھ شادی

کرلوں۔ اس لیے میں نے اسے فوراً" ہی انکار کردیا۔ میرا خیال تھا کہ میرے انکار کے بعد وہ خاموش ہوکر بیٹھ جائے گا مگر اس نے تو گویا میرا پیچھا ہی لے لیا تھا۔ ہر روز فون کرتا بار بار ملنے کے لیے چلا آتا۔

میں اگرچہ اس کو مسلسل انکار کررہی تھی مگر اس کے لیے میرے لہجے میں سختی ایک بار بھی نہیں آئی تھی اب غور کرتی ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ شاید میرے لاشعور میں بھی اس وقت یہ خواہش پیدا ہوچکی تھی کہ میری شادی تابش سے ہوجائے اس لیے تو میں اس سے کبھی سختی سے پیش نہیں آئی تھی۔ البتہ بیس بائیس دن گزرنے کے بعد میں نے عالیہ باجی کو ساری صورتحال بتادی تھی۔ تابش ان کا سسرالی عزیز تھا اور میں نہیں چاہتی تھی کہ کل کو کوئی ایسی صورتحال پیدا ہو جس کا ذمہ دار مجھے ٹھہرایا جائے۔ عالیہ باجی میری بات سن کر حیرت زدہ سی ہوگئیں۔

"کیا واقعی تابش نے تم سے ایسی بات کی ہے"۔

کئی لمحوں کے بعد وہ بولیں تو ان کے لہجے میں بے یقینی تھی اور چہرے پر بڑے عجیب سے تاثرات تھے جنہیں میں کوئی معنی نہ پہنا سکی اور خاموشی سے اثبات میں سرہلادیا۔

"اسے صاف انکار کردو بھلا تمہارا اور اس کا کوئی جوڑ ہے۔ کئی سال چھوٹا ہے تم سے اور ویسے بھی چچی اس کی شادی اپنی بیٹی سے کرنا چاہتی ہیں۔"

انہوں نے فوراً" ہی دوٹوک انداز میں کہا تھا اگرچہ ان کے کہے بغیر بھی میں تابش کو صاف انکار ہی کررہی تھی مگر نہ جانے کیوں ان کے منہ سے یہ سب سن کر مجھے اچھا نہیں لگا۔ اور میرا ان سے مزید کوئی بات کرنے کو دل نہیں چاہا۔ حالانکہ وہ مجھ سے ابھی باتیں کرنا چاہتی تھیں مگر میں ضروری کام کا کہہ کر ان کے گھر سے جلد لوٹ آئی۔ میرے دل پر ایک عجیب سا بوجھ آپڑا تھا اور مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اگلے کئی روز میرے اسی کیفیت میں گزرے تو میں گھبرا سی گئی اور چند روز کے لیے بھائی کے گھر جاکر رہنے کا فیصلہ کرلیا کیونکہ وہاں ان کے بچوں کے ساتھ میرا دل کافی بہل جایا کرتا تھا اور اب تو بھابی بھی مجھے سر آنکھوں پر بٹھاتی تھیں۔ میں نے وہاں جانے کا فیصلہ اچانک ہی کیا اور بغیر کوئی پیشگی اطلاع دیئے بھائی کے گھر پہنچ گئی۔

بیرونی دروازہ کھلا ہوا تھا اس لیے اپنی کار باہر پارک کرنے کے بعد میں بے دھڑک اندر چلی آئی اندر کمرے سے باتوں کی آواز آرہی تھی اور آوازوں سے میں نے فوراً" ہی اندازہ لگالیا کہ میری دونوں بہنیں بھی آئی ہوئی ہیں۔ میں یکدم ہی خود کو ہلکا پھلکا اور خوش محسوس کرنے لگی تھی یوں جیسے صحرا میں چلتے چلتے کوئی مسافر سائے تلے پہنچ جائے یا کسی بچھڑے ہوئے کو اچانک اس کے اپنے مل جائیں اور اس کے وجود سے لپٹی تنہائی کی گرد پل بھر میں غائب ہوجائے۔ مگر میری یہ خواہش زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکی تھی اب میں برآمدے تک پہنچ چکی تھی اور اندر سے آتی آوازوں کو بخوبی سن سکتی تھی۔ وہ یقیناً" عالیہ باجی تھیں جو میرے بارے میں بات کررہی تھیں۔

"کچھ بھی ہوجائے ہمیں مومنہ کو اس شادی سے روکنا ہوگا۔ اس کا اور اس لڑکے کا کوئی جوڑ نہیں ہے۔"

اگرچہ ان کے الفاظ کم و بیش وہی تھے جو کچھ دن پہلے انہوں نے میرے سامنے کہے تھے۔ مگر آج ان کا لہجہ مختلف تھا۔ آج ان کے لہجے میں ایک عجیب سا تنفر اور غصہ تھا جس نے پل بھر کے لیے مجھے سن کردیا۔

"اور کیا مومنہ کی بھلا اب کوئی شادی کی عمر رہی ہے۔ بڑھاپے کی دہلیز پر بیٹھی ہے اور شادی کرنے کا شوق چڑھا ہے"۔

یہ میری دوسری بہن شائستہ تھی۔ مجھے حیرت ہورہی تھی کہ میری سگی بہن میرے بارے میں اس طرح سے بات کررہی ہے۔ بے شک میری ان دونوں سے کبھی بھی دوستی نہیں رہی تھی مگر میں ان کی بہن تو

تھی نا۔ پھر وہ کس دل سے میری تحقیر کر رہی تھیں۔ کیا ان کو ایک بار بھی یہ خیال نہیں تھا کہ میرا ان سے خون کا رشتہ ہے۔

"ارے وہ لڑکا مومنہ کی دولت کے پیچھے ہے۔ اور یہ بی بی خود کو قلوپطرہ سمجھ رہی ہیں۔"

بھابی بھلا کسی سے کیوں پیچھے رہتیں۔ انہوں نے بھی اپنی زبان سے زہر اگلنا ضروری سمجھا تھا۔ ان کے لہجے میرے لیے وہی تحقیر اور نفرت تھی جو میں اپنے نوجوانی کے اولین دور سے محسوس کرتی آئی تھی مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ پچھلے کچھ عرصے سے میں نے ان کا یہ لہجہ کیسے بھلا دیا تھا ان کی شیریں بیانی کو کیسے ان کی اصل سمجھ لیا تھا۔ ان کے دل میں تو آج بھی میرے لیے کوئی جگہ نہیں تھی وہ تو آج بھی مجھ سے اتنی ہی نفرت کرتی تھیں جتنی ان کے انداز میں میرے لیے تب ہوا کرتی تھی جب میں نے ان کی اور بھائی کی نافرمانی کر کے اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھنے پر اصرار کیا تھا۔

"دیکھو بھئی سیدھی بات ہے۔ ہم نے تو سوچا تھا کہ مومنہ کے پاس جو کچھ بھی ہے اور جتنا بھی وہ مزید کمائے گی وہ کل کو ہمارے ہی بچوں کے کام آئے گا۔ لیکن آج اگر وہ شادی کر لیتی ہے تو ہمارا یہ خواب خواب ہی رہ جائے گا۔ اس لیے اس وقت تو ہمیں کچھ ایسا کرنا ہے کہ کسی بھی طرح اسے اس شادی سے باز رکھیں۔ اسے اپنائیت اور پیار سے سمجھاؤ کسی بھی طرح سے اس لڑکے کے خلاف مومنہ کے دل میں زہر بھر دو۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا اور میرے خیال سے دوبارہ وہ شادی کا نام بھی نہیں لے گی۔"

یہ میرا اکلوتا بھائی تھا۔ اس قدر بے رحم، شقی القلب اور لالچی میرا دل شدت سے چاہا کہ میں اندر جاؤں اور وہاں بیٹھے لوگوں میں سے ایک ایک کا منہ نوچ لوں انہیں آئینہ دکھاؤں اور ان کی زندگیوں سے ہمیشہ کے لیے نکل جاؤں مگر میں چاہ کے بھی ایسا نہ کر سکی پتا نہیں ایسی کون سی چیز تھی جس نے میرے قدموں کو آگے بڑھنے سے روکے رکھا۔ میں اگلے کئی منٹ تک وہیں ساکت کھڑی رہی اور آنسو میرا چہرہ بھگوتے رہے پھر میں نے دل ہی دل میں ایک فیصلہ کیا اور خاموشی سے وہاں سے پلٹ آئی۔

مین روڈ پر پہنچ کر میں نے اپنی کار سڑک کے کنارے روکی۔ اپنا آنسوؤں سے تر چہرہ صاف کیا اور پچھلی سیٹ سے منرل واٹر کی بوتل اٹھا کر ڈھیر سارا پانی پیا۔ جب میرے حواس قابو میں آ گئے تو زندگی میں پہلی بار میں نے تابش کو خود کال کی دوسری طرف سے پہلی ہی بیل پر میری کال ریسو کر لی گئی۔

"تابش! میں تم سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں"

دوسری طرف سے تابش کی آواز سنتے ہی میں نے کہہ دیا تھا۔

"تم سچ کہہ رہی ہو؟"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد تابش نے چہک کر پوچھا تھا۔

"ہاں اور میں چاہتی ہوں کہ یہ کام جلد سے جلد ہو جائے۔"

میں نے سکون سے کہہ کر فون بند کر دیا۔ اور اپنی کار اسٹارٹ کرنے لگی مجھے خود پر حیرت ہو رہی تھی تابش سے صرف ایک منٹ بات کی تھی اور میرا موڈ بالکل ٹھیک ہو گیا تھا میں خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ وہ غم، غصہ اور دکھ جس نے کچھ دیر پہلے مجھے اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا یکایک ہی کہیں غائب ہو گیا تھا۔ اور میں بڑے سکون سے کار چلاتی ہوئی اپنے گھر کی طرف رواں تھی۔

☼ ☼ ☼

مومنہ کے مان جانے کا اگرچہ میرے دل کو پہلے سے یقین تھا مگر پھر بھی جب اس نے فون کر کے مجھے یہ خوشخبری سنائی تو کتنی ہی دیر تک مجھے اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آیا۔ اور جب میں خود کو باور کروانے میں کامیاب ہو گیا کہ واقعی ایسا ہو چکا ہے تو میرا دل چاہا کہ میں خوشی سے بھنگڑے ڈالوں اور ایک ایک شخص کو

پکڑ پکڑ کر بتاؤں کہ میں کس قدر خوش اور مسرور ہوں۔ لیکن مجھے کسی کو یہ بتانے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ اس روز جو بھی مجھ سے ملا اسے میری بے پایاں مسرت کا خود بخود احساس ہو گیا۔ اور گھر کے لوگوں کو تو پتا ہی تھا کہ ان دنوں میرے حواس پر مومنہ ہی چھائی ہوئی ہے۔ اس لیے میری خوشی اور غم دونوں کی وجہ اس کے علاوہ کوئی نہیں ہو سکتی۔ مگر وہاں مجھ سے کسی نے پوچھا نہیں کہ میں کیوں اس قدر خوش دکھائی دے رہا ہوں۔

خالہ تو ان دنوں مجھ سے ویسے ہی ناراض تھیں اور ضرورتاً بھی بات نہیں کرتی تھیں۔ باقی لوگوں کے موڈ بھی زیادہ اچھے نہ تھے اگرچہ باقی لوگ خالہ کی طرح مجھ سے اعلانیہ ناراض تو نہیں تھے مگر پھر بھی کھنچے کھنچے سے رہنے لگے تھے۔ کیونکہ ان کے ہر طرح سے سمجھانے بجھانے کے باوجود میں مومنہ سے ہی شادی کرنے پر مصر رہا تھا۔ اس لیے اب وہ مجھے سمجھانا ترک کر کے مجھ سے ایک طرح سے لاتعلق ہو گئے تھے۔

صرف ایک خالو جان تھے جنہوں نے شروع دن سے نہ تو اس معاملے میں کوئی رائے دی تھی اور نہ ہی ان کا رویہ مجھ سے بدلا تھا۔ اور باقی لوگوں کے رویے کی مجھے بھی کوئی پروا نہیں تھی۔

ان دنوں میں نے اپنا معمول بنا رکھا تھا۔ کہ صبح سویرے بغیر ناشتا کیے گھر سے چلا جاتا اور رات گئے باہر سے کھانا کھا کر گھر گھستا۔ اور اشد ضرورت کے سوا کسی کو بھی مخاطب نہیں کرتا تھا۔ مگر اب صورت حال مختلف تھی مومنہ نے کہا تھا کہ میں اپنی خالہ اور خالو کو اس کے بھائی کے پاس رشتے کے لیے بھیجوں اس لیے مجھے خالہ سے نا صرف یہ بات کرنی تھی بلکہ منوانا بھی تھی۔ مگر میں نے خالہ سے جیسے ہی یہ بات کی انہوں نے ہچکیوں ہچکیوں رونا شروع کر دیا۔ اس روز نجمہ باجی بھی آئی ہوئی تھیں اور خالہ کے پاس ہی بیٹھی تھیں۔ خالہ کو یوں روتا دیکھ کر انہوں نے ایک ملامتی نظر مجھ پر ڈالی اور خالہ کو چپ کروانے لگیں۔

"امی! آپ مان لیں نا اس کی بات۔ جب یہ خوش ہے تو آپ کیوں ضد کر رہی ہیں۔"

باجی نجمہ نے خالہ کو گلے لگاتے ہوئے بہت نرمی سے سمجھایا تھا اور کم از کم یہ میرے سامنے تو پہلی بار ہو رہا تھا کہ کسی نے میری حمایت کی ہے۔ اس لیے مجھے بھی تھوڑا سا حوصلہ ہو گیا۔ اور میں خالہ کو منانے کی کوشش کرنے لگا مگر جب وہ میری کسی بھی بات کا جواب دینے کی بجائے بس روتی ہی رہیں تو مجھے بھی غصہ آ گیا۔

"ٹھیک ہے خالہ اگر آپ مومنہ کے بھائی کے پاس میرا رشتہ لے کر نہیں جانا چاہتیں تو آپ کی مرضی مگر مجھے شادی اسی سے ہی کرنا ہے چاہے آپ رضامند ہوں یا نہ ہوں۔ میں خود ہی کچھ کر لوں گا آپ نہ جائیں۔"

بہت اکتا کر میں نے کہا تھا۔ خالہ کا اتنا شدید رد عمل میری برداشت سے باہر ہو گیا تھا اس وقت مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ میری خوشیوں کی راہ میں رکاوٹ بن رہی ہیں۔

"تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے تابش! ہم کل ہی مومنہ کے بھائی سے بات کرنے جائیں گے۔"

خالو اچانک ہی اندر آئے تھے اور پہلی بار اس موضوع پر کچھ بولے تھے۔ حالانکہ اتنے دنوں سے گھر میں یہ موضوع زیر بحث تھا مگر وہ سب کچھ سن کر بھی یوں رہتے تھے جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ ان کا یہ رویہ کسی ایک معاملے میں نہیں تھا وہ ہمیشہ ہی کسی کے بھی معاملے میں دخل دینے سے پرہیز کیا کرتے تھے تاوقتیکہ کوئی شخص خود ان سے رائے مانگے ان کے اس طرز عمل کی وجہ سے ان کے اور باقی گھر والوں کے درمیان ایک جھجک سی مانع رہا کرتی تھی۔ اور اسی جھجک کی وجہ سے میں اب تک مومنہ کے بارے میں ان سے بات نہیں کر پایا تھا۔

"مومنہ بھی ہماری بچیوں جیسی ہی ہے۔ اب اس کے بارے میں کوئی بھی منفی انداز سے بات نہ کرے۔ میں کل ہی اس کے بھائی سے شادی کی تاریخ بھی طے کر آؤں گا"۔

خالو کا انداز ہمیشہ کی طرح دو ٹوک تھا۔ اور وہاں کسی

میں ہمت نہیں تھی کہ ان کے فیصلے کے آگے کچھ بولے اس لیے سبھی خاموش ہوگئے تھے حتیٰ کہ خالہ کے بہتے آنسو بھی تھم گئے تھے۔ خالو اب انہیں سمجھا رہے تھے اور میں بے حد مطمئن سا باہر نکل آیا خالو کے اس معاملے میں پڑتے ہی میں خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا تھا اب میرے سر پر کوئی ذمہ داری نہیں رہی تھی، اب جو بھی کرنا تھا خالو جان نے خود ہی کرلینا تھا۔ اور یہی ہوا تھا میری شادی کے دن تک انہوں نے نا صرف سارے معاملے خوش اسلوبی سے سنبھالے رکھے تھے بلکہ انہی کی وجہ سے گھر کے تمام لوگوں کا رویہ بھی مجھ سے پہلے جیسا ہوگیا تھا۔ اور وہ میری خوشی میں خوش نظر آنے لگے تھے۔

☼ ☼ ☼

میرے لیے تابش کا رشتہ آیا تو میری بھائی بھائی اور بہنوں نے یکساں واویلا کیا۔ وہ سب بس یہ چاہتے تھے کہ میں یہ خیال اپنے دل سے نکال دوں اور پہلے کی طرح اپنی زندگی گزارتی رہوں اور میں اگر ایک روز پہلے ان کی باتیں نہ سن چکی ہوتی تو شاید ان کی باتوں پر نئے سرے سے سوچنے بیٹھ جاتی مگر اب ایسا نہیں تھا میں فیصلہ کرچکی تھی اور میرا اسے بدلنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اور اس لیے میں تابش کی خالہ اور خالو کے آنے سے پہلے ہی بھائی کے گھر بھی آگئی تھی اور میں نے انہیں اپنے فیصلے سے آگاہ بھی کردیا تھا میرے وہاں پہنچنے کے ایک گھنٹے کے اندر ہی میری بہنیں بھی وہاں آگئیں اور وہ چاروں مجھے گھیر کر سمجھانے بیٹھ گئے۔ مجھے اس شادی سے روکنے کے لیے انہوں نے دلائل کا ایک انبار میرے سامنے لگادیا۔ مگر جب میں ٹس سے مس نہ ہوئی تو عالیہ باجی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔

"آخر تم سمجھتی کیوں نہیں ہو مومنہ! اس لڑکے کو تم میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ صرف تمہاری دولت کی وجہ سے تمہارے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ ورنہ خود سوچو تمہارا اور اس کا کوئی جوڑ بنتا ہے۔"

ان کا لہجہ اتنا ہی تحقیر بھرا تھا جتنا ایک روز پہلے میرے بارے میں باتیں کرتے ہوئے تھا۔ مگر آج ان کے اس لہجے نے مجھے کل کی طرح سن نہیں کیا تھا۔ اور نہ ہی ان کے انداز پر میری آنکھوں میں آنسو آئے تھے اپنے خونی رشتوں کی بے مروتی پر مجھے جتنا رونا تھا میں ایک روز پہلے ہی رو چکی تھی۔ اب ان کے اپنے بارے میں کسی بھی طرح سے بات کرنے یا کچھ بھی کہنے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس لیے عالیہ باجی کے اس تحقیر آمیز انداز کے باوجود بالکل پرسکون بیٹھی رہی۔

"میں جانتی ہوں کہ وہ میری دولت کی وجہ سے مجھ سے شادی کررہا ہے اور مجھے اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں ہے۔"

میں بولی تو میرا لہجہ بالکل صاف اور آواز ہموار تھی۔

"مگر جب کل کو اس کی لالچی طبیعت کا تمہیں ادراک ہوگا تو تم پچھتاؤ گی۔"

شائستہ باجی نے مجھے ڈرانے کی کوشش کی۔

"میں نہیں پچھتاؤں گی۔ کیونکہ میں پہلے سے جانتی ہوں کہ تابش کو مجھ میں کشش صرف میری دولت کی وجہ سے محسوس ہورہی ہے۔ مگر ہم جس سے بھی شادی کا فیصلہ کرتے ہیں۔ اس کی کسی نہ کسی خوبی سے متاثر ہوکر ہی کرتے ہیں۔ اور اگر تابش کو دولت میری خوبی لگ رہی ہے۔ تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے اور بہتر ہے کہ آپ لوگ بھی اب کوئی اعتراض نہ کریں۔" بات کرتے کرتے آخر میں میرا لہجہ اچھا خاصا کھردار ہوگیا تھا جس کا خاطر خواہ اثر ہوا اور ان لوگوں نے مزید کچھ کہنے کی کوشش نہیں کی بلکہ تابش کے گھر والے آئے تو ان سے بھی بڑے اچھے طریقے سے بات کی اور اس روز میری شادی کی تاریخ بھی طے کردی۔ مجھے ان کے اس طرز عمل پر کوئی حیرت نہیں ہوئی تھی۔ وہ لوگ یہ بات اچھی طرح سے سمجھ چکے تھے کہ میں ہر حال میں تابش سے شادی کرلوں گی اس لیے اب مجھ سے مخالفت مول لے کر وہ اس تھوڑے، بہت مفاد سے بھی محروم نہیں ہونا چاہتے تھے جو ان کو مجھ سے حاصل ہونے کی توقع تھی۔

شادی کی تاریخ ایک ماہ بعد کی رکھی گئی تھی۔ اس ایک ماہ میں میں نے اپنے۔ اور تابش کے لیے خوب شاپنگ کی۔ اور بے دریغ دولت خرچ کرتی رہی میرا گھر پہلے سے سجا سجایا اور ہر طرح کی سہولیات سے مزین تھا مگر میں پھر بھی گھر کی از سر نو آرائش پر رقم خرچ کرتی رہی۔ میری بہنیں اور بھابیاں بھی اکثر آجایا کرتی تھیں۔ اور مجھے یوں تیاریاں کرتے دیکھ کر بظاہر خوشی کا اظہار کرنے کے باوجود کوئی نہ کوئی ایسی چبھتی ہوئی بات ضرور کردیا کرتی تھیں جو مجھے کئی کئی روز تک بے چین رکھا کرتی تھی۔ کیونکہ اندر سے میں بھی شدید قسم کے احساس عدم تحفظ کا شکار تھی۔ اپنے سے کئی برس چھوٹے اور اپنے سے کئی گنا خوبصورت شخص سے شادی کرنے کا میں فیصلہ تو کر بیٹھی تھی مگر اب فیصلے کے نتائج کیا نکلنے والے تھے میں اس بارے میں کوئی بھی اندازہ لگانے سے قاصر تھی مجھے نہیں معلوم تھا کہ جو جوا میں کھیلنے جارہی ہوں اس میں میرے ہاتھ کچھ آئے گا بھی یا میں وہ بھی گنوا بیٹھوں گی جو میرے پاس اس وقت موجود تھا۔ طرح طرح کی سوچیں اور وسوسے مجھے پریشان کرتے رہتے تھے اور شاید انہیں سوچوں اور وسوسوں سے بچنے کے لیے ہی میں اپنا دھیان شادی کی تیاریوں پر لگائے رکھتی تھی۔

☼ ☼ ☼

مومنہ کے ساتھ شادی کی تاریخ طے ہوتے ہی میں گویا ہواؤں میں اڑنے لگا تھا میں نے جتنے بھی خواب اپنی زندگی میں دیکھے تھے اس کی تعبیر ملنے کا وقت آگیا تھا۔ میں تصور ہی تصور میں کئی مرتبہ خود کو مومنہ کی شاندار کوٹھی میں ٹہلتے ہوئے دیکھتا جہاں نوکروں کی ایک فوج میرے اشارہ ابرو کی منتظر ہوا کرتی تھی۔ بہترین ملبوسات اعلا درجے کے کھانے اور قیمتی کاریں۔ مجھے دن رات للچائے رکھتی تھیں اگرچہ میں اچھی طرح سے جانتا تھا کہ مومنہ سے شادی کرنے کے فیصلے کے بعد خاندان کے اکثر افراد مجھے لالچی سمجھنے لگیں گے۔ مگر مجھے ان لوگوں کے خیالات یا ان کے تبصروں سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ میں ان سب کی طرح ایک ایک خواہش کو ترستے ہوئے زندگی نہیں گزار سکتا تھا۔ اس لیے مجھے جیسے ہی اپنی منزل مقصود تک کا شارٹ کٹ نظر آیا میں نے فوراً ہی اس موقع سے فائدہ اٹھالیا۔ اب کوئی مجھے لالچی کہے یا خود غرض میری بلا سے۔ میں تو بس اپنی آئندہ زندگی کے خوبصورت اور سہانے خوابوں میں ہی خوش رہنے لگا تھا۔

باقی لوگ شادی کی تاریخ طے ہونے کے بعد اپنے اپنے جیون ساتھی کے بارے میں سوچتے ہیں مگر میں باقی ہر چیز کے بارے میں سوچ رہا تھا سوائے مومنہ کے۔ ویسے بھی مومنہ کے بارے میں کیا سوچتا؟ میں نے تو کبھی پورے دھیان سے اس کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ میرے لیے تو وہ بس آسائشوں بھری زندگی گزارنے کا لائسنس تھی۔ اس لیے میں اس کو نہیں بلکہ اس کی وجہ سے عنقریب حاصل ہونے والی آسائشوں کا تصور کرکے خوش ہوتا رہتا تھا۔ مگر پھر ایک عجیب بات ہوئی جوں جوں شادی کے دن نزدیک آتے گئے میرے دل و دماغ پر اپنے ہونے والے جیون ساتھی کا خیال چھانے لگا۔ اب میں لاکھ سر جھٹکتا اپنے آپ کو دوسری سوچوں کی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتا مگر پھر تھوڑی ہی دیر کے بعد میرے خیالات کی رو بھٹک جاتی اور میں مومنہ کے بارے میں سوچنے لگتا۔ اور شاید انہی خیالات اور سوچوں کا ہی اثر تھا کہ اپنی شادی کی رات جب میں اپنے حجلہ عروسی کی طرف جارہا تھا تو میرا دل ایک بالکل نئی اور انجانی سے لے پر دھڑک رہا تھا۔ آج سے پہلے میں نے کبھی اس لڑکی کے بارے میں نہیں سوچا تھا اور نہ ہی کبھی کسی لڑکی نے میرے حواسوں پر قبضہ کیا تھا۔ میں تو ہمیشہ سے صرف دولت کے بارے میں سوچتا آیا تھا۔ صنف نازک کے بارے میں سوچنے کا تو مجھے کبھی خیال ہی نہیں آیا تھا مگر شادی کی رات جب میں مومنہ کا گھونگٹ اٹھا رہا تھا تو میرا سارے کا سارا دھیان اس پر تھا۔ باقی ہر بات میرے ذہن سے محو ہوچکی تھی۔

پہلے میرا خیال تھا کہ مومنہ کے قریب جانے کے

لیے شاید مجھے خود پر جبر کرنا پڑے گا اور میں ذہنی طور پر اس کے لیے تیار بھی تھا مگر شادی کی رات میری اپنی کیفیت عجیب سی ہو رہی تھی جسے میں بالکل سمجھ نہیں پا رہا تھا ہاں اتنا ضرور تھا کہ میں خود کو بے حد خوش محسوس کر رہا تھا۔

میں ـــ اس کا گھونگھٹ اٹھا رہا تھا مگر اس نے اپنا سر اتنا زیادہ جھکایا ہوا تھا کہ مجھے اس کی پیشانی اور پیشانی پر سجے جھومر اور ٹیکے کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ اس کے اس انداز پر میں ہلکے سے مسکرا دیا۔ پھر میں نے اپنی جیب سے وہ انگوٹھی برآمد کی جو میں نے اس کے لیے خریدی تھی اور اس کا مہندی اور چوڑیوں سے سجا ہاتھ تھام لیا۔ اس کا ہاتھ بے حد سرد ہو رہا تھا۔ اور اس میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی مجھے بے اختیار ہی اس پر پیار آنے لگا اور میں نے انگوٹھی پہنانے کی بجائے اس کا ہاتھ چوم لیا میرے اس انداز پر اس نے بے اختیار ہی اپنا سر اوپر اٹھا کر میری طرف دیکھا تھا۔ میں اس کی جانب دیکھ رہا تھا مگر جب میں نے اس کا چہرہ دیکھا تو ایک پل کے لیے مبہوت ہی رہ گیا وہ اتنی خوبصورت بھی لگ سکتی ہے میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ میں اسے انگوٹھی پہنانا بھی بھول گیا تھا۔ بس ساکت بیٹھا ٹکر ٹکر اس کا چہرہ دیکھے جا رہا تھا۔ میرے اس انداز پر وہ شرما گئی۔ اور اس کے شرمانے کی ادا نے اس کے حسن کو جیسے دو آتشہ بنا دیا تھا۔ میں نے بے خودی کے عالم میں اس کا ہاتھ تھاما اور اس کی انگلی میں انگوٹھی پہنانے لگا۔

اس وقت میں خود کو کسی ٹرانس میں محسوس کر رہا تھا مجھے مال و دولت روپیہ پیسہ سب کچھ بھول گیا تھا۔ اس وقت میرے دل و دماغ پر صرف اور صرف مومنہ کا قبضہ تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ میری شادی شدہ زندگی کی پہلی صبح تھی۔ اور اتنی خوبصورت تھی کہ مجھے خود ہی اپنے نصیب پر رشک آئے جا رہا تھا۔ وہ سارے ڈر خوف اور وسوسے جنہوں نے مجھے پچھلے پورے مہینے سے پاگل کر رکھا تھا ایک ہی رات میں کہیں غائب ہو گئے تھے۔ بلکہ اپنے ساتھ وہ میری زندگی بھر کی محرومیوں کو بھی کہیں دور لے گئے تھے میں خود کو اتنا پر اعتماد محسوس کر رہی تھی جتنا میں نے پوری زندگی میں کبھی نہیں کیا تھا۔ تابش کا ساتھ اس کا گزشتہ رات کا والہانہ انداز اس کی محبت یہ سب مجھے جیسے آسمانوں پر اڑائے لے جا رہے تھے۔

میں بے تحاشا خوش تھی تابش نے صرف میرے اندیشے میں ہی نہیں دور کیے تھے۔ بلکہ اپنی محبت اور اپنائیت سے وہ اعتماد بھی بخشا تھا۔ جس کے سہارے اب میں زندگی کی ہر آزمائش کا مقابلہ کر سکتی تھی۔ میں خود کو بے حد معتبر محسوس کر رہی تھی۔ اب میرا بھی کوئی اپنا تھا جس سے میں اپنے سارے دکھ سکھ شیئر کر سکتی تھی۔

تابش کے ساتھ نے میری خاموش اور ویران زندگی کو رنگوں اور روشنیوں سے بھر دیا تھا۔ میری بہنوں اور بھابی نے اس کے حوالے سے مجھے جس جس اندیشے سے ڈرایا تھا۔ میں اب ان اندیشوں کے متعلق سوچتی تک نہ تھی۔ وہ لوگ کہتی تھیں کہ تابش نے دولت کی وجہ سے مجھ سے شادی کی ہے اور تب میں صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہتی تھی کہ مجھے اس بات پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ تب تو یہ صرف ایک جواب ہوتا تھا مگر اب مجھے احساس ہوتا تھا کہ تابش کے ساتھ اور اس کی محبت کے مقابلے میں تو یہ دولت میرے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ میرا تو دل چاہتا تھا کہ میں اپنے ہاتھوں سے اس پر اپنی تمام دولت لٹا دوں۔ اس کا صرف میرے سامنے ہونا مجھے ایسی خوشی سے ہمکنار کرتا تھا۔ جس کا ذائقہ میں نے آج تک نہیں چکھا تھا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوتا تو مجھے اپنی سماعتوں پر رشک آنے لگتا۔ وہ میرے چہرے پر محبت بھری ایک نظر ڈال لیتا تو خوشی سے میرے قدم زمین پر نہیں ٹکتے تھے۔

اس کی وجہ سے میں نے زندگی میں پہلی بار اپنا خیال رکھنا شروع کیا تھا میں باقاعدگی سے جم اور پارلر جانے لگی تھی۔ اپنے لیے پہلی بار پورے شوق اور دل سے شاپنگ کرنے لگی تھی۔ اور اپنی شخصیت میں آنے والے نکھار کو پوری طرح سے محسوس کرنے لگی تھی۔

صرف میں ہی نہیں میری شخصیت میں آنے والی مثبت تبدیلیوں کو باقی لوگ بھی محسوس کرنے لگے تھے۔ اور یقینی طور پر بے حد حیران بھی تھے۔ انہوں نے جو کچھ میرے اور تابش کے رشتے کے حوالے سے سوچا تھا۔ اور جن جن باتوں سے مجھے ڈرانے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ اصل صورت حال اس سے بہت مختلف نکلی تھی۔ میں تابش کا ساتھ پا کر بے حد خوش اور مطمئن نظر آنے لگی تھی اور حیرت کی بات یہ تھی کہ اس شادی کے بعد میری بہنوں بھائی اور بھابی کا رویہ بھی میرے ساتھ بہت اچھا ہو گیا تھا۔ اور میں واضح طور پر محسوس کرنے لگی تھی کہ مجھ سے بات کرتے ہوئے ان کے انداز میں اب جو خوشامد اور چاپلوسی ہوتی ہے۔ وہ پہلے کبھی نہیں ہوا کرتی تھی حالانکہ میں سمجھ رہی تھی کہ ان سب کی مخالفت مول لے کر میں جو شادی کر رہی ہوں اس کے بعد تو وہ میری شکل دیکھنے کے بھی روادار نہیں ہوں۔ مگر اس کے برعکس وہ نا صرف اکثر مجھ سے فون پر بات کرتے تھے بلکہ ہفتے میں ایک دو دفعہ میرے گھر بھی ضرور آیا کرتے تھے۔ اور باقاعدہ اصرار کر کے مجھے اور تابش کو اپنے گھر بلاتے اور ہماری خوب آؤ بھگت کرتے تھے۔ ان کی اتنی ساری مہربانیاں حیران کرنے کے ساتھ مجھے بہت خوش بھی کرتی تھیں اور میں بھی جواباً" ان کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھنے کی کوشش کرتی تھی اور ان کا خیال رکھنے کا بہترین طریقہ یہی تھا کہ ان پر اور ان کے بچوں پر بے تحاشا روپیہ لٹایا جائے۔ اور میں ایسا اب مجبوری سے نہیں اپنی خوشی سے کرتی تھی۔ اللہ نے مجھے اتنی ڈھیروں خوشیاں عطا کر دی تھیں میرے نامکمل وجود کو تکمیل دے دی تھی۔

میں ان دونوں اتنی خوش تھی کہ مجھے کائنات کی ہر چیز خوبصورت لگنے لگی تھی۔ ہر رشتہ اچھا لگتا تھا ان لوگوں پر بھی پیار آنے لگا تھا جن سے مجھے زندگی بھر دکھ ہی ملے تھے۔

اپنے گھر والوں سے اچھا سلوک کرنے کے ساتھ ساتھ میں تابش کی خالہ اور ان کے گھرانے کا بھی بہت خیال رکھتی تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے اتنے سالوں تک تابش کا اتنی محبت سے خیال رکھا اور جب تابش نے مجھے اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہا تو انہوں نے اس معاملے میں روڑے نہیں اٹکائے اس لیے مجھے وہ سب بھی بہت عزیز ہو گئے تھے اور میں ہر ہفتے تابش کے ساتھ اس کی خالہ کی گھر جاتی تھی اور ان لوگوں سے خوب گھل مل کر باتیں کرتیں ۔ حالانکہ تابش اکثر وہاں جانے سے ہچکچاہٹ سی محسوس کرتا تھا مگر میں چاہتی تھی کہ اس کا رشتہ اپنے لوگوں سے ہمیشہ مضبوط رہے۔ اس لیے میں تابش کو ساتھ لے کر گاہے بگاہے اس کی خالہ کے گھر چلی جاتی تھی اور ان لوگوں کو بھی بصد اصرار اپنے گھر بلاتی تھی۔ اور مجھے محسوس ہوتا تھا کہ تابش بے شک منہ سے کچھ نہ کہے مگر میرا اس کی خالہ کے گھرانے کو اہمیت دینا اسے بہت اچھا لگتا تھا۔

☆ ☆ ☆

مومنہ سے شادی کر کے مجھے وہ سب کچھ مل گیا تھا۔ جس کی میں نے عمر بھر آرزو کی تھی۔ عالیشان گھر، قیمتی کاریں اور نوٹوں سے ہمہ وقت بھرا رہنے والا والٹ، اب میں جو چاہتا وہ خرید سکتا تھا اور جیسے چاہتا روپے خرچ کر سکتا تھا۔ اگرچہ ابتدا میں اپنے اور مومنہ کے جوائنٹ اکاؤنٹ سے بڑی بڑی رقمیں نکالتے ہوئے مجھے تھوری سی ہچکچاہٹ بھی ہوتی تھی کہ وہ اس بارے میں کوئی باز پرس نہ کرے مگر پھر جب میں نے دیکھا کہ میں اکاؤنٹ سے کتنی ہی بڑی رقم ـــ نکلوالوں وہ مجھ سے کچھ پوچھنا تو درکنار اس بارے میں کچھ کہتی تک نہیں تو میں بالکل بے دھڑک ہو کر رقمیں نکلوانے لگا اور اپنی مرضی کی زندگی گزارنے لگا۔

شادی کے چند ماہ بعد ہی میں نے اپنی جاب یہ کہہ کر چھوڑدی کہ میں اب اپنا کوئی بزنس کرنا چاہتا ہوں وہ تب بھی بالکل نارمل رہی۔ اس نے مجھے اس ضمن میں کوئی مشورہ دیا اور نہ ہی بزنس کرنے سے روکنے کی کوشش کی۔ بلکہ جب میں نے گتے کی ایک چلتی ہوئی چھوٹی سی فیکٹری خریدنے کی بات کی تو اس نے بلا جھجک مجھے میری مطلوبہ رقم فراہم کردی حالانکہ وہ اتنی خطیر رقم تھی کہ مومنہ سے اتنی رقم کا ذکر کرنے سے پہلے میں تین روز تک اپنے ذہن میں ان فقروں کو ترتیب دیتا رہا تھا جو مجھے مومنہ کے سامنے بول کر اپنی مطلوبہ رقم حاصل کرنا تھی مگر اس وقت میں صحیح معنوں میں شاکڈ رہ گیا جب اس نے میرے سرسری ذکر کرنے پر ہی مجھے اتنی بڑی رقم یوں تھمادی جیسے کوئی بات ہی نہ ہو اس کے اس عمل نے مجھے گویا اس کا گرویدہ کرکے رکھ دیا۔

وہ مجھے اتنی اچھی لگی کہ میرا دل چاہنے لگا کہ اس کے دامن میں زمانے بھر کی خوشیاں بھر دوں۔ اور مجھے اچھی طرح سے پتا تھا کہ وہ سب سے زیادہ خوش اس بات سے ہوتی ہے کہ میں اسے وقت دوں اور اس کے ساتھ کہیں گھومنے پھرنے جاؤں اس لیے ان دنوں اپنے نئے نئے کام کی شدید مصروفیات کے باوجود میں اس کو پوری توجہ دینے کی کوشش کرتا تھا آخر وہ میرے لیے خزانے کی وہ کنجی تھی جس نے مجھ پر آسائشوں اور خوشیوں کے تمام تر دروازے کھول دیے تھے۔

بزنس شروع کرنے کے بعد بھی میں نے کئی بار اس سے بڑی بڑی رقوم کا مطالبہ کیا۔ جو اس نے ہر بار بلا جھجک پورا کردیا۔ میں چونکہ اس فیلڈ میں بالکل اناڑی تھا۔ اس لیے مجھے قدم جماتے جماتے ساڑھے تین سال لگ گئے درمیان میں کئی بار لڑکھڑایا کئی بار گرتے گرتے بچا مگر ساڑھے تین برس کے بعد میرا بزنس نا صرف جم گیا بلکہ روز افزوں ترقی بھی کرنے لگا۔

☼ ☼ ☼

شادی کے ڈھائی سال کے بعد اللہ نے مجھے ایک صحت مند اور بے حد خوبصورت بیٹے سے نوازا۔ جو ہو بہو تابش جیسا تھا۔ میرے لیے یہ معجزے سے بھی کچھ بڑھ کر تھا۔ یہ وہ خواب تھا جسے دیکھنے کی میں نے کبھی جرات ہی نہیں کی تھی۔ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ میں بھی ماں بن سکتی ہوں۔ میں نے اپنے بیٹے کا نام عالیشان رکھا۔ میں اسے پاکر اس قدر خوش تھی کہ مجھے اپنی پچھلی زندگی کی کوئی محرومی بھولے سے بھی یاد نہیں آتی تھی۔ عالیشان کے آنے کے بعد تابش کے لیے میری محبت کچھ اور گہری ہوگئی تھی آخر یہ وہی تو تھا جس کی وجہ سے میری زندگی میں خوشیاں آئی تھیں اور میری ذات مکمل ہوئی تھی۔ میں پہلے سے بھی بڑھ کر اس کا خیال رکھنے لگی تھی۔ ان دنوں میں جیسے کسی خواب نگری کا حصہ بن گئی تھی۔ مجھے میرے اللہ نے ہر چیز دے دی تھی۔ بے تحاشا دولت، گھر، شوہر، اولاد، آخر اس سے زیادہ کوئی اپنے لیے کیا چاہ سکتا ہے۔

کبھی کبھی مجھے اپنی ہی خوش قسمتی خوفزدہ کردیتی۔ اور میں گھبرا سی جاتی۔ کہ کہیں میری خوشیوں بھری زندگی کو کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ ہر لحاظ سے مکمل اور خوبصورت زندگی نے مجھے وہمی سا بنا دیا تھا۔ یا پھر شاید یہ میری چھٹی حس تھی جو آنے والے کسی منحوس لمحے کی آہٹ سن کر مجھے خبردار کررہی تھی اس وہم کا شکار میں پہلی بار تب ہوئی جب عالیشان کی پیدائش کے تقریباً" ایک سال بعد مجھے تابش کے رویے میں تبدیلی محسوس ہوئی۔ وہ عجیب کھویا کھویا اور پریشان سا رہنے لگا تھا۔ راتوں کو بہت دیر سے گھر آتا اور اکثر آتے ہی سو جایا کرتا تھا۔ میں نے کئی بار اس سے پوچھنے کی کوشش بھی کی مگر اس نے جواب میں یوں چپ سادھے رکھی کہ میں خود ہی شرمندہ ہو کر پیچھے ہٹ گئی اور خود کو طرح طرح کی تاویلوں سے بہلانے کی کوشش کرنے لگی۔

"اس کے بزنس میں کوئی پرابلم ہوگا"

"اس کا اس وقت بات کرنے کا موڈ نہیں ہوگا"

"وہ کچھ وقت صرف اپنے ساتھ خاموشی سے گزارنا چاہتا ہوگا"

میں طرح طرح کے کھلونوں سے خود کو بہلاتی مگر تابش کی چپ نے مجھے اندر سے بے حد پریشان کردیا تھا۔ مجھے کسی پہلو قرار نہیں تھا خوف اندیشوں اور وسوسوں نے میری خواب نگری کو جیسے ویران کرکے رکھ دیا تھا۔ میں ایک بار پھر بے حد پریشان اداس اور تنہا ہوگئی تھی۔ مجھے بھری دنیا میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں ملتا تھا جس سے میں اپنے اندر پلتے ان اندیشوں اور خوف کے بارے میں بات کرسکوں۔ بعض اوقات اپنی اس کمزوری پر مجھے خود پر حیرت بھی ہوتی۔ کیونکہ تابش کے ساتھ شادی کا فیصلہ کرتے وقت میں نے اس امکان کو بھی ذہن میں رکھا تھا کہ اگر شادی کے چند سال بعد اس نے مجھے چھوڑ کر کسی اور کا ہاتھ تھام لیا تو کیا ہوگا۔ تب تو میرا یہی خیال تھا کہ میں اپنے اس پرانے انداز سے زندگی گزارنے لگوں گی جس انداز سے شادی سے پہلے گزرتی آئی تھی مگر اب میں ایسا سوچنے بھی لگتی تو میری سانسیں رکنے لگتی تھیں۔ تابش کے ساتھ گزرے خوشیوں بھرے ساڑھے تین سال اتنے مکمل اور خوبصورت تھے کہ اب مجھے اپنی پچھلی زندگی میں جانے کا خیال بھی سزائے موت کے مترادف لگ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

مومنہ کے ساتھ میری زندگی کے ساڑھے تین سال انتہائی خوشگوار گزرے۔ ان ساڑھے تین سالوں نے مجھے بہت کچھ دیا۔ اپنا جما جمایا بزنس، معاشرے میں باعزت مقام اور سب سے بڑھ کر خود اعتمادی جس نے میری پرسنالٹی کو چار چاند لگادیئے تھے۔ ان سب کامیابیوں کے پیچھے ایک ہی نام تھا۔ ڈاکٹر مومنہ۔ ان ساڑھے تین سالوں میں اس نے میرا بے تحاشا خیال رکھا۔ اور کبھی بھی مجھ سے بحث یا بدتمیزی نہیں کی بلکہ اکثر تو میرے ساتھ اس کا رویہ اتنا عقیدت بھرا ہوتا کہ میں خود کو کوئی بہت برتر مخلوق سمجھنے پر مجبور ہوجاتا۔ اس کا یہ عقیدت بھرا انداز مجھے بے حد اچھا لگتا تھا۔ اس کی نرم مزاجی، حد سے زیادہ خیال رکھنے والی عادت اور پھر ہمارا بیٹا عالیشان تابش، یہ سب چیزیں شاید عمر بھر کے لیے مجھے اس سے باندھ دیتیں اگر بیچ میں ملیحہ رفیق نہ آجاتی۔

ملیحہ میرے بزنس پارٹنر تنویر کی کزن تھی اور زرعی یونیورسٹی سے ایم بی اے کررہی تھی اس سے میری ملاقات اتفاقاً" ہی ہوئی تھی میں اس روز تنویر اور کچھ دوسرے لوگوں کے ساتھ بزنس لنچ کے لیے کینال روڈ پر عثمانیہ ہوٹل میں گیا ہوا تھا۔ وہیں ملیحہ بھی اپنی کچھ دوستوں کے ساتھ موجود تھی۔ میں اور تنویر ساتھ ہی ہوٹل میں گئے تھے اس لیے ملیحہ کو دیکھ کر تنویر علیک سلیک کے لیے رکا تو میں بھی اس کے ساتھ تھا اور تنویر نے ہی ملیحہ کے ساتھ میرا تعارف کروایا تھا۔ میں اس گلابی رنگت اور جادو بھری آنکھوں والی بے حد حسین لڑکی کو دیکھ کر مبہوت سا ہوگیا۔ وہ حسین ہونے کے ساتھ ساتھ بہت ذہین اور بولڈ بھی تھی یہ اندازہ مجھے اس سے چند منٹ گفتگو کرکے ہی ہوگیا تھا۔

وہ مجھے بہت اچھی لگی تھی مگر ایسا بھی نہیں ہوا تھا کہ اس سے پہلی ملاقات نے ہی مجھ پر جادو کردیا ہو بلکہ میں تو اسے شام تک بھول بھی چکا تھا۔ مگر اسی رات جب اس نے مجھے میرے سیل پر فون کیا تو میں حیران رہ گیا۔ وہ میرے اندازے اور توقع سے بڑھ کر بولڈ لڑکی تھی اس نے نہ صرف ملاقات کے پہلے ہی روز مجھے فون کردیا تھا بلکہ اسی روز میرے لیے اپنی پسندیدگی کا اظہار بھی کردیا تھا۔ اور میرے لیے اس کی پسندیدگی میں یہ جان کر بھی کوئی کمی نہیں آئی تھی کہ میں شادی شدہ اور ایک بیٹے کا باپ ہوں۔ وہ ہنوز بے حد والہانہ بلکہ محبوبانہ انداز سے مجھ سے باتیں کرتی رہی تھی۔ میں نے اپنی پچھلی زندگی میں کبھی کوئی اتنی فرینک نیچر کی لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ اور یہ شاید اس کا اس قدر فرینک اور بولڈ ہونا ہی تھا جو مجھے دنوں میں اس کے اتنا نزدیک لے گیا کہ میں خود حیرت زدہ سا رہ گیا۔ وہ یکایک ہی مجھے ساری دنیا سے زیادہ اچھی لگنے لگی تھی۔ میں اور وہ ہر روز ملنے لگے تھے اس کی کمپنی اس کی باتیں اس قدر دلچسپ ہوا کرتی تھیں کہ اس کی قربت میں

میں دنیا کی ہر چیز کو بھول جایا کرتا تھا۔ ان دنوں مجھے ہمہ وقت اس کا خیال رہنے لگا تھا۔ یہ میرے لیے ایک بالکل نیا تجربہ تھا۔ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ مجھے کسی لڑکی سے محبت بھی ہو سکتی ہے۔ میں نے تو جب سے ہوش سنبھالا تھا۔ تب سے صرف اور صرف دولت آرام آسائشات سے ہی محبت کرتا آیا تھا۔ مگر اب ایک لڑکی میری زندگی میں آچکی تھی اور میں اس پر جی بھر کر دولت اور محبت لٹا رہا تھا۔ ان دنوں میرا اپنے گھر سے دل بالکل اچاٹ ہو گیا تھا اور میں وہاں صرف سونے کے لیے جایا کرتا تھا۔

میں رات گئے گھر لوٹتا تو مومنہ اکثر میرے انتظار میں جاگ رہی ہوتی مگر میں اسے مخاطب تک نہیں کرتا تھا۔ ان دنوں مجھے مومنہ سے شدید قسم کی بےزاری محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ مجھے خوش رکھنے کے جتنے بھی جتن کرتی اتنی ہی میری بے زاری بڑھتی جاتی تھی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ اسے دھواں بنا کر اڑا دوں وہ میری زندگی میں کہیں نہ ہو۔ اور ایسی خواہش کرتے ہوئے میں یہ بات بالکل بھول جایا کرتا تھا کہ یہ وہی مومنہ تھی جس سے شادی کرنے کے لیے چار برس پہلے میں مرا جا رہا تھا اور آج میں جو کچھ بھی تھا اس کی وجہ سے تھا۔ میری خود غرضی نے میری آنکھوں پر ایسی پٹی باندھ دی تھی کہ مجھے اپنی ذات اور اپنی خوشیوں کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ مومنہ میرے اس بدلے ہوئے روّیے کی وجہ سے پریشان ضرور تھی مگر اس نے ایک بار بھی مجھ سے کوئی گلہ نہیں کیا تھا۔ ہاں ایک عجیب سا خوف تھا جو اس کی آنکھوں میں مستقل ٹھہر کر رہ گیا تھا مگر مجھے اس کے خوف سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ بلکہ مومنہ تو ایک طرف ان دنوں تو مجھے اپنے اکلوتے بیٹے میں بھی کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی تھی۔ در حقیقت مجھے ملیحہ کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ بزنس سے بھی میری توجہ ہٹ چکی تھی اور ادھر سے بھی مجھے نقصان پر نقصان ہو رہا تھا مگر مجھے ملیحہ کے سوا کسی بھی بارے میں سوچنے کا ہوش نہیں تھا۔

میں شدید قسم کے ادھیڑ بن میں مصروف تھا مجھے کوئی ایسا طریقہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا جس کے ذریعے میں مومنہ کو اپنی زندگی سے غائب کر کے اس کی جگہ ملیحہ کو دے دوں۔ پتا نہیں کیا بات تھی کہ میں کئی بار کوشش کرنے کے باوجود مومنہ کو ملیحہ کے بارے میں نہیں بتا سکا تھا۔ مگر پھر جب ایک روز ملیحہ نے مجھے روتے ہوئے بتایا کہ اس کے گھر والے اس کی کہیں اور منگنی کر رہے ہیں تو میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اور میں نے ہر لحاظ کو بالائے طاق رکھتے ہوئے مومنہ کو اپنی زندگی سے بے دخل کرنے کا اعلان کر دیا۔

☼ ☼ ☼

”میں تم سے تنگ آگیا ہوں۔ میں تمہارے ساتھ نہیں ملیحہ کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔ آخر تم میرا پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتیں۔“ اس کے لہجے میں بے زاری، نفرت، غصہ، ہر وہ چیز تھی جس کے اندیشوں نے میری کئی راتوں سے نیند اڑائی ہوئی تھی۔ اس کے انداز میں میرے لیے بیگانگی اور —— آئے ہوئے تو بہت دن ہو چکے تھے۔ مگر میں پھر بھی اپنے دل کو یہ کہہ کر بہلاتی رہی تھی کہ شاید سب کچھ ٹھیک ہو جائے شاید ایک بار پھر سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے۔ مگر آج میری خوش گمانیوں کے تمام محل ایک ایک کر کے میری آنکھوں کے سامنے مسمار ہو رہے تھے۔ فیصلے کی گھڑی آچکی تھی۔ اور میں کچھ بھی نہیں کر پا رہی تھی۔ بس آنکھوں میں آنسوؤں کا سمندر لیے بے بسی سے اس کے ہلتے لبوں کو دیکھ رہی تھی۔ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا۔ اسے سننے کے باوجود میری سماعتیں سمجھنے سے انکاری تھیں۔ گو کہ تابش کے بدلے ہوئے روّیے سے میں کئی روز سے بہت پریشان تھی۔ اور یہ دھچکا شدید ہونے کے باوجود میرے لیے اچانک نہیں تھا مگر پھر بھی میں خود کو سنبھالنے سے قاصر تھی۔ تابش میرے لیے دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر تھا وہ چلا جاتا تو میری تو زندگی ہی ختم ہو جاتی۔ عجیب سا خالی پن تھا جو میرے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ اور میں چاہنے کے باوجود کچھ بھی بولنے سے قاصر تھی۔ بس ٹکر ٹکر اس کا

خوبصورت چہرہ دیکھے جا رہی تھی جس پر اس وقت میرے لیے کسی بھی قسم کی اپنائیت نہیں تھی۔

”میں یہ گھر چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جا رہا ہوں“ پہلے سے بھی بڑھ کر بے زاری —— لہجے میں سمو کر وہ بولا تو میں جیسے چونک کر حواسوں میں آگئی۔ وہ اب کمرے سے نکل کر سیڑھیوں کی طرف جا رہا تھا میں دیوانہ وار اس کے پیچھے بھاگی۔

”تابش! تابش پلیز رک جاؤ مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ“

میں بلند آواز سے روتے ہوئے التجائیں کر رہی تھی مگر اس نے ایک بار بھی پلٹ کر نہیں دیکھا اور اپنا پاؤں پہلی سیڑھی پر رکھ دیا۔

”تابش! تم چلے گئے تو میں زندہ کیسے رہوں گی میں مر جاؤں گی تابش!“

میں نے بے اختیار ہی اس کی قمیض کا کالر پیچھے سے پکڑ کر اسے روکنا چاہا تھا۔

”تو مر جاؤ تم میں کیا کروں“

وہ جھنجھلا کر مڑا اور ایک جھٹکے سے اپنا کالر چھڑا کر اگلی سیڑھی پر قدم رکھ دیا۔ مگر میں اس اچانک جھٹکے سے سنبھل نہ پائی اور سیڑھیوں پر لڑھکتی چلی گئی۔

”مومنہ“ وہ بے اختیار چیخا تھا میری آنکھوں کے آگے گہرا سیاہ اندھیرا چھا رہا تھا جب میں نے اسے دیوانہ وار بھاگ کر اپنی طرف آتے دیکھا مگر اس کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی میں ہر احساس سے عاری ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

میں تیسری سیڑھی پر تھا جب میں نے اسے سیڑھیوں پر سے تیزی سے لڑھکتے دیکھا۔ ایک پل کے لیے تو میرے اعصاب سن ہو کر رہ گئے اپنی شرٹ کا کالر اس کے ہاتھ سے چھڑاتے ہوئے میں دھیان ہی نہیں کر سکا تھا کہ وہ سیڑھیوں کے کنارے پر کھڑی ہے۔ اور یوں اچانک لگنے والے جھٹکے کے بعد اس کے لیے توازن برقرار رکھنا نا ممکن حد تک مشکل ہے۔

مومنہ! میں نے خود کو چیختے سنا اور تیزی سے اس کی

طرف لپکا وہ تب تک بے ہوش ہو چکی تھی۔ اس کے سر سے خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ میں نے بے اختیار ہی اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور اسے چیخ چیخ کر آوازیں دینے لگا اس وقت میرے اعصاب مکمل طور پر جواب دے چکے تھے اور مجھے کچھ نہیں پتا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ وہ تو ملازموں نے اسے خون میں لت پت دیکھ کر فوراً" ہسپتال پہنچایا ورنہ میں تو شاید وہیں اس کا سر گود میں رکھے چلاتا رہتا۔

اسے فوراً" آپریشن تھیٹر لے جایا گیا تھا اس کے سر پر بہت گہری چوٹ آئی تھی۔ آپریشن کرنے سے پہلے ڈاکٹر نے مجھ سے فارم پر سائن کروائے تو میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا مجھے ایک پل کے لیے یوں لگا کہ جیسے میں نے مومنہ کے ڈیتھ وارنٹ پر سائن کر دیئے ہوں۔

"ڈاکٹر صاحب! وہ بچ تو جائے گی نا؟"

ڈاکٹر مرتضیٰ کا ہاتھ پکڑ کر میں نے بہت بے چارگی سے پوچھا تھا انہوں نے میرے کندھے پر تسلی آمیز انداز میں تھپکی دی اور بولے۔

"آپ دعا کریں تابش صاحب! دعا میں بہت تاثیر ہوتی ہے۔" مجھے دلاسا دے کر وہ آپریشن تھیٹر کی طرف مڑ گئے اور میں سن سا وہیں کھڑا رہ گیا۔ انہوں نے مجھے واضح طور پر کچھ نہیں کہا تھا مگر ان لوگوں کی آپس کی سرگوشیوں اور وہاں کے حالات سے مجھے خود ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ ڈاکٹر مومنہ کی زندگی کے لیے زیادہ پرامید نہیں ہیں۔ مجھے اپنا دل سینے کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا ہوا محسوس ہوا اور میں لڑکھڑا کر صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

مومنہ کا آپریشن پورے ڈھائی گھنٹے چلا تھا اور وہ ڈھائی گھنٹے میں نے آپریشن تھیٹر کے باہر کاریڈور میں ٹہل ٹہل کر کس طرح گزارے یہ میں ہی جانتا ہوں۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے میرے جسم سے دھیرے دھیرے جان نکل رہی ہو میرے اندر اتنی گھٹن تھی کہ مجھے سانس لینے میں بھی دشواری ہو رہی تھی۔ اس وقت مجھے مومنہ کے سوا ایک پل کے لیے بھی کسی کا خیال نہیں آیا تھا نہ مجھے ملیحہ رفیق یاد آئی نہ اپنے اکلوتے بیٹے کی طرف میرا دھیان گیا اور نہ ہی مجھے کروڑوں روپے کی جائیداد کا خیال آیا جس کی مومنہ مالک تھی اور اگر خدانخواستہ اسے کچھ ہو جاتا تو اس جائیداد کا بڑا حصہ مجھے ہی ملنا تھا میں جو ساری زندگی دولت کے پیچھے دیوانہ وار بھاگتا آیا تھا اب میرے لیے کروڑوں کی جائیداد بھی بے معنی تھی۔ اس وقت مجھے صرف مومنہ چاہیے تھی اس کا ساتھ چاہیے تھا میں بچوں کی طرح بلک بلک کر اللہ سے اس کی زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔

انہی ڈھائی گھنٹوں میں مجھ پر پہلی بار یہ انکشاف ہوا کہ میں تو مومنہ سے بہت محبت کرنے لگا ہوں اتنی محبت کہ اگر اسے میری زندگی سے نکال دیا جائے تو میرے پاس تو کچھ بچے گا ہی نہیں میں تو خالی ہاتھ رہ جاؤں گا۔ میں نے اس سے شادی صرف اور صرف دولت اور آسائشوں کے حصول کے لیے کی تھی اور میرے گمان میں بھی کبھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ میں ایک دن اس کی محبت میں مبتلا ہو جاؤں گا۔ مگر اب ایسا ہو چکا تھا اور یہ محبت مجھے اس کی کسی کوالٹی کی وجہ سے نہیں ہوئی تھی۔ نہ ہی اس لیے کہ اس کی بدولت میں نے زندگی میں پہلی بار ان آسائشوں کو حاصل کیا تھا۔ جن کے لیے میں ہمیشہ سے ترستا آیا تھا۔ مجھے تو اس محبت سے محبت ہوئی تھی جو وہ مجھ سے کرتی تھی۔ بغیر کچھ کہے، بغیر کچھ جتائے بالکل خاموش اور بے غرضی سے۔ میری چھوٹی سے چھوٹی خوشی کا بھی وہ اپنی جان سے بڑھ کر خیال رکھتی رہی تھی۔ اور جواب میں اس نے کبھی کوئی صلہ نہیں مانگا میری توجہ اسے خوش کرتی تھی مگر اس نے کبھی زبردستی میری توجہ بھی حاصل نہیں کی تھی بلکہ میں خود اس کو جتنی بھی توجہ دے دیا کرتا وہ اس پر قانع اور خوش رہتی تھی۔

ان ڈھائی گھنٹوں میں مجھے رہ رہ کر اس کی وہ بے تحاشا محبت یاد آتی رہی جو پچھلے ساڑھے تین سالوں

میں بارش کی طرح مجھ پر برسی تھی۔ میں اس کا محنت سے کمایا ہوا روپیہ پانی کی طرح بہاتا رہا تھا مگر اس نے ایک بار بھی زبان تو کیا اپنے کسی عمل سے بھی یہ بات نہیں جتائی تھی۔ نہ ہی اس نے کسی بھی موقع پر خود کو مجھ سے برتر ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔

"ڈاکٹر مومنہ کی حالت اب خطرے سے باہر ہے تابش صاحب! آپ چھ گھنٹے بعد ان سے مل سکتے ہیں"

میں اپنے سود و زیاں کے حساب میں اس قدر الجھا ہوا تھا کہ مجھے ڈاکٹر مرتضیٰ کے باہر آنے کی خبر ہی نہیں ہوئی اور جب انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے یہ مژدہ جانفزا سنایا تو میں چند لمحوں کے لیے حیرت اور بے یقینی سے ان کا چہرہ دیکھتا رہا جو کامیابی کی خوشی سے دمک رہا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور میں جہاں کھڑا تھا وہیں سجدہ ریز ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

ان سارے واقعات کو اب آٹھ برس گزر چکے ہیں اور میں اب دو بیٹوں اور ایک بیٹی کی ماں ہوں میرا گھر خوشیوں اور مسرتوں کا گہوارہ ہے۔ تابش واقعی مجھ سے دل سے محبت کرتا ہے۔ اور اس کی محبت کی تابناکی نے میری پوری زندگی کو روشن کر دیا ہے۔ اس کی اپنائیت اور توجہ نے میرے چہرے کو ایسی چمک بخش دی ہے کہ میری بہنیں اور بھابی رشک سے میرا چہرہ دیکھتی ہیں اور میری کولیگز ہنس کر کہتی ہیں۔

"یہ تو سنا تھا کہ وقت کچھ لوگوں پر ٹھہر جاتا ہے۔ مگر وقت کا پہیہ الٹی طرف بھی چلتا ہے ایسا ہوتے صرف تمہارے ساتھ ہی دیکھا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے ہر گزرتا سال تمہارے چہرے پر کوئی نقش چھوڑنے کی بجائے کسی نقش کو مٹا کر جاتا ہے۔"

ایسی باتیں سن کر میرا دل خوشی سے سرشار ہو جاتا ہے مگر میں اپنے اندر تفاخر نہیں پیدا ہونے دیتی بلکہ پہلے سے بھی بڑھ کر عاجزی اختیار کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔

تابش کا کاروبار اب بہت پھیل چکا ہے اور وہ مجھ سے بھی زیادہ کمانے لگا ہے۔ مگر اب اس میں بہت سی مثبت تبدیلیاں آ گئی ہیں۔ وہ بہت نرم مزاج ہو گیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے مزاج میں ایک عجیب سی انکساری پیدا ہو گئی ہے۔ اب وہ ہر ویک اینڈ بہت خوشی سے اپنی خالہ کے گھر گزارتا ہے۔ ورنہ پہلے وہ مارے باندھے ہی وہاں جایا کرتا تھا میرے اور اس کے بیچ محبت کے ساتھ دوستی کا رشتہ بھی پیدا ہو چکا ہے۔ جو ہر گزرتے دن کے ساتھ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جا رہا ہے۔ البتہ کبھی کبھار وہ مجھے چھیڑنے کے لیے کہتا ہے۔

"مومی! تمہیں پتا ہے میں نے تم سے شادی صرف تمہاری دولت کے لیے کی تھی"

تب میں ہنس کر کہتی ہوں۔

"جانتی ہوں اور یہ بھی جانتی ہوں کہ تمہیں دوبارہ موقع دیا جائے تو تم محبت کی وجہ سے مجھ سے شادی کرو گے"

اور ہر بار وہ مسکرا کر میری تائید کرتا ہے۔

☼ ☼